بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف آغاز

۲۵و۲۶، اپریل اور ۱۲ر مئی ۲۰۱۵ء کو آنے والے شدید زلزلے نے لوگوں کے دل ودماغ کو حد درجہ متاثر اور خوف زدہ کر دیا ہے، ان زلزلوں کا مرکز نیپال کا دارالحکومت کاٹھمنڈو اور اس سے چند کلومیٹر دور ایک مقام تھا، لیکن اس کے اثرات بنگال سے لے کر دہلی تک ہندوستان کے مختلف علاقوں اور صوبوں میں محسوس کیے گئے، ہندوستان میں اس کی وجہ سے جانی ومالی نقصانات تو بہت زیادہ نہیں ہوئے، لیکن نیپال جیسے چھوٹے اور کمزور ملک کو اس نے زیر وزبر کر کے رکھ دیا ہے، کئی ہزار افراد چشم زدن میں لقمۂ اجل بن گئے، بے شمار افراد تباہ وبرباد ہوگئے، لاتعداد مکانات ومحلات اور بلند وبالا عمارتیں دیکھتے ہی دیکھتے زمین بوس ہوگئیں، حقیقت یہ ہے کہ نیپال کا منظر واقعی قیامت صغریٰ کا نمونہ تھا۔

کئی دنوں تک لگاتار اور پھر چند ہفتے بعد آنے والے ان زلزلوں نے لوگوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے، کئی ہفتے گزرنے کے باوجود بہت سے لوگ اس کے تصور سے آج بھی سہم جاتے ہیں، بہت سے لوگوں پر اس کے جو اثرات ہوئے ہیں وہ آج بھی گھبراہٹ، بے چینی اور خفقان قلب کی شکل میں پائے جاتے ہیں۔

اس طرح کے حوادث و واقعات سے سبق لینے اور نصیحت حاصل کرنے کی ضرورت ہے، ان کو خداوند قدوس کی طرف سے تنبیہ سمجھنا چاہئے کہ اس کے ایک حکم پر پوری زمین تہ وبالا ہوسکتی ہے، اس کی قوت وقدرت کا کوئی اندازہ اور حد وحساب نہیں ہے، وہ ہر چیز کا مالک اور ہر چیز پر قادر ہے، اور جب زمین پر بگاڑ پیدا ہوتا ہے، خدا کی نافرمانی ہونے لگتی ہے، اس کے احکام سے روگردانی اور سرتابی ہونے لگتی ہے، گناہوں اور معاصی کا چلن بڑھ جاتا ہے، تو خدا کا قہر وجلال اور اس کا غضب جوش میں آتا ہے، اور روئے زمین پر اس کا اثر تباہی وبربادی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، امت محمدیہ سے پہلے دنیا کے اندر دوسری قومیں جو ہوئی ہیں، ان کے حالات و واقعات کو پڑھنا، معلوم کرنا اور ان سے عبرت حاصل کرنا

چاہیئے، ان کو معلوم کرنے کا سب سے بہتر اور معتبر ذریعہ قرآن کریم ہے، گزشتہ قوموں کے حالات و واقعات معلوم کرنے کے لیے قرآن کریم سے زیادہ مستند اور معتبر ذریعہ کوئی نہیں ہوسکتا، اللہ رب العزت نے اس میں تفصیل سے متعدد قوموں کے حالات بیان فرمائے ہیں، قوم نوح، عاد، ثمود، قوم لوط وغیرہ کی سرکشی، بدعملی اور بدکرداری وغیرہ کے واقعات جگہ جگہ، کہیں اجمالی اور کہیں تفصیل سے، بیان فرمائے ہیں، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ ان کو پڑھ کر عبرت حاصل کریں، اور اپنی زندگی کو اس سانچے میں ڈھالیں جو خدا کا پسندیدہ ہے، اور جس کے مطابق زندگی گزارنے میں اللہ کی پکڑ اور اس کی گرفت سے نجات ممکن ہے۔ گزشتہ قوموں کے واقعات ہی کی طرح آج بھی روئے زمین پر پیش آنے والے تباہ کن زلزلے، ہلاکت خیز سیلاب، اور ہولناک طوفان جیسے حوادث تازیانۂ عبرت ہیں، اس لیے ان سے سبق لینا چاہیئے، کہ

یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

ترمذی شریف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے ایک حدیث منقول ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: **قال رسول اللہ ﷺ: إذا فَعَلَتْ أُمَّتِی خَمْسَ عَشَرَةَ خَصْلَةً حَلَّ بِهَا البَلَاءُ، فَقِیلَ: وَمَا هُنَّ یَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: إذَا کَانَ المَغْنَمُ دُوَلاً، والأمَانَةُ مَغْنَماً، والزَکوٰة مَغْرَماً، وأطَاعَ الرَّجُلُ زَوْجَتَه، وعَقَّ أُمَّه، وَبَرَّ صَدِیقَه، وجَفَا أباه، وارْتَفَعَتِ الأصواتُ فِیْ الْمَسَاجِدِ، وکان زعیمُ القومِ أرذَلَهم، وأُکْرِمَ الرجُلُ مخافةَ شرہ، وشُرِبَتِ الخُمُورُ، ولُبسَ الحَرِیرُ، واتُّخِذَتِ القَیْنَاتُ والمَعَازِفُ، ولَعَنَ آخرُ هذہِ الأمةِ أولها، فلیَرْتَقِبُوا عِند ذٰلِکَ رِیْحاً حَمْرَاءَ أوخَسْفاً أومَسْخاً.**

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ پندرہ چیزیں ایسی ہیں کہ اگر ان میں میری امت گرفتار ہوگئی تو وہ آزمائش میں پڑ جائے گی: جب مال غنیمت دولت مندوں اور مالداروں کے ہاتھوں میں محدود ہوکر رہ جائے، امانت کو مال غنیمت سمجھا جانے لگے، زکوٰۃ بوجھ بن جائے، مرد اپنی بیوی کی اطاعت وفرماں برداری کرے، اور اپنی ماں کی نافرمانی کرے، اپنے دوست کے ساتھ حسن سلوک کرے، اور اپنے باپ کے ساتھ بدسلوکی اور بے مروتی سے پیش آئے، مسجدوں میں آوازیں بلند ہونے لگیں، قوم کا رہنما ان کا ذلیل اور کمتر شخص ہوجائے، اور آدمی کی عزت واکرام اس کے شر سے بچنے کے لیے کیا جائے، شراب پی جانے لگے، ریشمی کپڑا پہنا جانے لگے، گانے بجانے والی عورتیں اور اس کے آلات اختیار کیے جانے لگیں، اس امت کے بعد میں آنے والے پہلے کے لوگوں کو برا بھلا کہنے لگیں، تو اس

وقت لوگوں کو سرخ آندھیوں کا، یا زمین کے دھنس جانے اور اس کے الٹ پلٹ جانے کا، اور صورتوں وشکلوں کے تبدیل ہو جانے کا انتظار کرنا چاہئے۔

یعنی یہ باتیں جو حدیث میں بیان فرمائی گئی ہیں، یہ سب خدا کے قہر اور اس کے غضب کو دعوت دینے والی ہیں، اور اس کا قہر وغضب مختلف طریقے اور صورت میں ظاہر ہو سکتا ہے۔

ترمذی شریف میں یہ حدیث **کتاب الفتن** کے **باب ماجاء في علامة حلول المسخ والخسف** کے تحت مذکور ہے، اس باب میں حضرت علیؓ کی اس روایت کے علاوہ یہی حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی وارد ہوئی ہے، اس میں مذکورہ علامتوں کو ذکر کرنے کے بعد آخر میں مذکور ہے: **فَلْیَرتَقِبُوا عند ذلک رِیحاً حمراءَ وزَلْزلةً وخَسْفاً ومَسْخاً وقَذْفاً وآیاتٍ تَتَابَعُ کنِظَامٍ بالٍ قُطِعَ سِلْکُه فَتَتَابَع.** یعنی جب یہ برائیاں عام ہو جائیں، تو لوگوں کو سرخ آندھی، زلزلہ، زمین دھنس جانے، شکل وصورت بدل جانے، پتھر برسنے اور ان جیسی نشانیوں (آفات) کا انتظار کرنا چاہئے، جو اس طرح مسلسل پیش آئیں گی، جیسے کوئی ہار پرانا اور بوسیدہ ہو جائے، اس کی لڑی ٹوٹ جائے، تو اس کی موتیاں ایک ایک کر کے گرتی جائیں۔

اس حدیث کی روشنی میں ہم کو اپنے عمل کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کیا ہماری انفرادی واجتماعی زندگی میں یہ برائیاں اور خرابیاں بری طرح سرایت نہیں کر گئی ہیں، کیا مال ودولت چند ہاتھوں میں مرکوز ہو کر نہیں رہ گئی ہے؟ بد دیانتی اور امانت میں خیانت عام بات نہیں ہوگئی ہے؟ زکاۃ کی ادائیگی کو بوجھ نہیں سمجھا جانے لگا ہے؟ کیا کوئی گھر ایسا ہے جو بیوی کی خوشامد، اس کی جی حضوری اور ماں کی نافرمانی اور اس کی ایذا رسانی سے پاک ہو، اور کیا دوست کے ساتھ وفاداری اور حسن سلوک اور باپ کے ساتھ بدسلوکی روز افزوں نہیں ہے؟ اور دنیا کی کون سی بات اور لغویات ہیں جن سے مساجد محفوظ ہیں؟ اور کون سی مسجد ہے جس میں شور وشغب کی شکایت نہ ہو؟ کیا قوم وملت کی رہنمائی آج انتہائی پست لوگوں کے ہاتھوں میں نہیں ہے؟ ان کے علاوہ اور بھی جو باتیں اس حدیث میں بیان کی گئی ہیں، کیا وہ ایک ایک کر کے ہمارے معاشرے میں پائی نہیں جا رہی ہیں؟

اس لیے ہم کو اپنی حالت پر غور کرنا چاہئے، اور جن کی اصلاح ہمارے اختیار میں ہو، اس کے لیے پوری فکر اور کوشش کرنی چاہئے، جب ہی ہم خدا کی پکڑ اور گرفت سے بچ سکتے ہیں، اور اگر ہماری رفتار یونہی بے ڈھنگی رہی، تو ہمارا حشر کیا ہوگا، خدا ہی جانتا ہے۔

ماخوذ: از تفسیر عزیزی (مسلسل)

تفسیر سورۂ انفطار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

غرور، تمنا اور رجاء کے درمیان فرق:

اب یہ جاننا چاہئے کہ یہاں تین چیزیں ہیں:

(۱) غرور (۲) تمنا (۳) رجاء

غرور و تمنا کو قرآن میں جگہ جگہ ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے، ان کی مذمت آئی ہے، جیسے فرمایا: ''لَا یَغُرَّنَّکُمْ بِاللّٰہِ الْغَرُوْر'' دوسری آیت: ''لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَا بِاَمَانِیِّ أَھْلَ الْکِتَابِ'' تیسری آیت: ''وَتِلْکَ اَمَانِیُّھُمْ'' ان کے علاوہ اور بھی آیات ہیں۔

رجاء جس کا معنی امید ہے قرآن وحدیث دونوں میں اس کی مدح و تعریف آئی ہے، اس کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے، جیسے فرمایا ''یرجون رحمۃ اللّٰہ'' اور دوسری آیات میں بھی اس کی مدح آئی ہے، لہٰذا ان تینوں کے درمیان واضح فرق معلوم ہونا چاہئے تا کہ اچھی اور بری چیز کے درمیان التباس نہ رہے۔

رجاء کی حقیقت:

امید کی حقیقت یہ ہے کہ کسی دل پسند اور مرغوب چیز کے اسباب مہیا کر کے اس کے انتظار میں دل خوش رہے، جیسے ایک کسان نے اچھا وعمدہ بیج ایک اچھی پیداواری زمین میں بویا، وقت پر زمین کو پانی بھی دیا اور ہر طرح سے محنت کی، اب وہ غلے کا منتظر ہے تو اس کو امید کہیں گے، کہ یہ کسان غلے کی امید میں ہے۔

غرور کی حقیقت:

اگر ایک چیز کے حاصل ہونے کے بہت سے اسباب ضائع کرنے کے باوجود اس چیز کے

انتظار میں کوئی رہے تو یہ غرور وحماقت ہے، جیسے ایک کسان نے بنجر زمین میں بیج بویا اور وقت پر زمین کو نہ سینچا پھر وہ غلے کی انتظار میں بیٹھا ہے تو یہ حماقت وغرور ہے۔

تمنا وآرزو کی حقیقت:

اگر کسی چیز کے اسباب مہیا ہونے میں شک ہے اس کے باوجود اس کا انتظار ہے، تو یہ محض تمنا وآرزو ہے، جیسے کوئی کسان اچھی زمین میں بیج بوتا ہے مگر زمین کو سینچا نہیں یا سینچا تو ہے مگر بیج بنجر زمین میں بویا، پھر غلے کی انتظار میں بیٹھا ہے تو اس کو آرزو کہتے ہیں۔

جب یہ مثالیں خوب اچھی طرح سمجھ میں آ گئیں، تو اب ایمان والے آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنی فلاح ونجات کے لیے اپنی قدرت وطاقت کے مطابق خوب کوشش کر کے اس کے اسباب جمع کرے، مثلاً اللہ تعالیٰ کے حکموں کو ماننا اور منع کی ہوئی باتوں سے بچنا وغیرہ اسباب نجات ہیں، پھر رحمت الٰہی کی امید میں خوش وخرم زندگی بسر کرے، لیکن جس نے اپنی فلاح ونجات کے سارے اسباب کھودیئے، اپنی عمر کو اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے خلاف چیزوں میں ضائع کر دیا، پھر بھی وہ نجات کا منتظر ہے تو یہ احمق ہے جو غرور میں مبتلا ہے، اور اگر اسباب نجات میں شک ہے جیسے نماز روزہ کیا، ان کی شرائط کا اچھی طرح خیال نہیں کیا پھر نجات کا منتظر ہے، تو وہ محض آرزومند ہے، اللہ تعالیٰ کو آخری دونوں صورتیں پسند نہیں ہیں۔

سلیمان بن عبدالملک اور شیخ ابوحازمؒ کی باہمی گفتگو:

حکایت ہے کہ سلیمان بن عبدالملک اپنے دارالخلافہ شام سے حج کے لیے حرمین شریفین حاضر ہوا، مدینہ طیبہ میں حضرت ابوحازم رحمہ اللہ سے ملاقات ہوگئی، سلیمان بن عبدالملک نے ان سے پوچھا بتایئے قیامت کے دن بندوں کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملاقات کی کیا کیفیت ہوگی؟

ابوحازمؒ نے فرمایا: اگر بندہ نیک ہے، دنیا میں نیکی کر کے گیا ہے، اس کی اللہ تعالیٰ سے ملاقات اس طرح ہوگی جیسے کوئی آدمی بہت طویل عرصے تک اپنے وطن سے دور رہا ہو، وہاں سے وہ بہت سارا مال واسباب کما کر ساتھ لایا ہو، اب آپ خود اندازہ لگالیں اس وقت وہ خود کتنا خوش ہوگا اور اس کے گھر والے کتنے خوش ہوں گے اور کس طرح اس کی خاطر داری اور خدمت کریں گے۔

اور اگر بندہ بدکار رہا، دنیا میں بدکاری کرتا رہا، اس کی ملاقات اس طرح ہوگی جیسے کوئی غلام

اپنے آقا کی چوری کر کے بھاگ گیا ہو، آقا نے اس کی تلاش میں اس کے پیچھے پیادے دوڑا دیئے ہوں، وہ پیادے اس کو پکڑ کر پاؤں میں بیڑیاں، ہاتھوں ہتھکڑیاں اور گردن میں طوق ڈال کر آقا کے سامنے لا کر پیش کریں، اندازہ کر لیجئے اس وقت اس غلام کی ذلت وحسرت کا کیا عالم ہوگا اور آقا کے سامنے کتنا ملعون ہوگا۔

یہ سن کر سلیمان بن عبدالملک پر رقت طاری ہوگئی اور بہت رویا، پھر کہنے لگا کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے وقت ان دونوں صورتوں میں سے مجھے کون سی صورت پیش آئے گی۔

ابوحازمؒ نے فرمایا اس بات کا معلوم کرنا بہت آسان ہے، قرآن میں اس کا صاف صاف ذکر موجود ہے۔سلیمان نے کہا کس آیت میں؟

ابوحازمؒ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:''اِنَّ الْاَبْرَارِ لَفِیْ نَعِیْمٍ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ'' اور فرمایا کہ اس آیت کی روشنی میں اپنے اعمال کا جائزہ لے لو کہ تم ''ابرار'' میں ہو یا ''فجار'' میں۔

سلیمان نے کہا اگر ہمارے اعمال کے مطابق انجام ہے تو اللہ کی رحمت کہاں گئی؟

ابوحازمؒ نے فرمایا اس کا پتہ بھی قرآن نے دے دیا ہے، سلیمان نے کہا کس آیت میں ہے؟

ابوحازمؒ نے فرمایا یہ آیت ہے:'' اِنَّ رَحْمَۃَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ''

یہ سن کر سلیمان پر خوف کا اتنا غلبہ ہوا کہ روتے روتے حالت متغیر ہوگئی اور یہ کہتا ہوا اٹھ کر چل دیا کہ مجھے تمہاری باتیں سننے کی طاقت نہیں، میرا پتا پھٹا جاتا ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ۝

جس نے تجھ کو بنایا پھر تجھ کو ٹھیک کیا پھر تجھ کو برابر کیا

اس سے پہلی آیت میں جب اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کو دیکھتے ہوئے فریب کھانے اور مغرور ہونے پر سرزنش کی کہ نرے کرم پر ہی مغرور نہیں ہونا چاہئے، اب یہاں سے کئی ایسی نعمتیں بیان فرما رہے ہیں جو تقاضا کرتی ہیں کہ اللہ کے فضل وکرم کی وجہ سے غرور میں گرفتار نہیں ہونا چاہئے، چنانچہ فرمایا:

''اَلَّذِیْ خَلَقَکَ'' وہ کریم کہ جس نے محض اپنے فضل وکرم سے تجھے پیدا کیا، نیست وعدم کی حالت میں تجھ سے کسی درخواست کا تصور بھی ناممکن ہے، اس نے بغیر تیری درخواست کے پیدا کیا، اور اس کو تیری پیدائش میں کسی نفع کی توقع بھی نہیں تھی۔

''فَسَوّٰکَ'' پھر تجھے ٹھیک بنایا، سب جوڑ اور اعضاء برابر کیے، دونوں ہاتھ ایک دوسرے کے برابر، دونوں پاؤں ایک دوسرے کے برابر، دونوں آنکھیں ایک دوسرے کے برابر، دونوں کان ایک دوسرے کے برابر، ان میں سے کوئی چھوٹا بڑا نہیں، پاؤں ہی مثلاً اگر چھوٹے بڑے ہو جاتے تو چلنے میں بھی دشواری ہوتی اور دیکھنے میں بھی برے معلوم ہوتے، یہ اسی کا کرم ہے کہ ایک قطرۂ ناپاک سے تجھے کیسا خوبصورت اور سڈول بنا دیا۔

''فَعَدَلَکَ'' پھر تیرے مزاج کو معتدل بنایا، بدن کے اخلاط کے جوارکان ہیں، گرمی، سردی، خشکی اور تری ان سب کو برابر اور متوازن رکھا، تاکہ اعتدال سے ہٹی ہوئی حالتیں معلوم کرسکو، ان کی پہچان کرسکو، اس سے یہ بھی سمجھ لو کہ جب ظاہری اعضاء کا اعتدال سے ہٹا ہوا ہونا تکلیف دہ ہوتا ہے تو باطنی بے اعتدالی کس قدر باعث تکلیف ہوسکتی تھی (مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس تکلیف سے بچایا)

فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ۝

جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ دیا

تیرے پروردگار نے جس طرح چاہا تجھے بنا دیا، اس وقت تم موجود نہیں تھے کہ مطالبہ کرتے کہ فلاں صورت اچھی ہے فلاں اچھی نہیں، مجھے اچھی صورت پر بنایا جائے بری صورت میں نہ بنایا جائے، اسی کا کرم ہے کہ انتہائی اچھی صورت پر تجھے بنا دیا، اور یہ اعضا اس نے اپنی اطاعت وفرمانبراری کے لیے بنائے ہیں، چنانچہ ہاتھ دیئے تاکہ تکبیر میں اٹھائے جائیں، ان میں قرآن کریم پکڑا جائے، جہاد کے لیے اسلحہ اٹھایا جائے، اور اس کے علاوہ بہت سے اعمال نیکی کے، ہاتھوں سے انجام پاتے ہیں۔

زبان عطا فرمائی، ذکر، تسبیح وتحمید، تلاوتِ قرآن اور نیکی کا حکم کرنے، برائی سے منع کرنے کے لیے، اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے حقائق بیان کرنے کے لیے۔

پاؤں دیئے، نماز میں کھڑے ہونے، جہاد کے لیے چلنے، طواف کرنے، مریض کی عیادت

کرنے، اولیاءاللہ کی زیارت کرنے کے لیےاور دیگر بہت سے امور خیر کے لیے۔

اسی طرح ہر عضوا پنی بندگی و اطاعت کے لیے عطا فرمایا مگر تم نے ان نعمتوں کو اس کے برعکس استعمال کیا، اللہ کی نافرمانی اور گناہوں کا ذریعہ بنایا، سو جس نے اپنے مالک کی ایسی نافرمانی کی ہو، وہ اس کی صفت کریمی کا ہرگز سزاوار و مستحق نہیں ہے، ایسے کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اللہ کے کرم پر فریب کھائے اور مغرور ہو بیٹھے۔

پیدائش کی نعمت بیان کرنے میں نکتہ:

اس مقام پر نعمتوں کو بیان کرتے ہوئے خاص پیدائش کی نعمت بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ نعمت ایسی ہے جس کے عطا ہونے میں نہ تو بندے کے سوال وخواہش کا دخل ہے، اور نہ اللہ تعالیٰ کو اس نعمت کے عطا کرنے میں کسی منفعت کی توقع یا ضرر کو دور کرنا مقصود تھا، یہ محض کرم ہی کرم ہے۔ بخلاف دوسری نعمتوں کے جو پیدائش کے بعد عطا ہوئیں، ان میں انسان کی خواہش وسوال کا کچھ نہ کچھ دخل ہے، خواہ انسان نے اپنی خواہش کا اظہار قولاً کیا ہو یا حالاً کیا ہو، لہٰذا یہ نعمتیں کرم پر دلالت نہیں کرتیں۔

اور ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ انسان کی پیدائش بہت ہی اچھے طریقے پر ہوئی، اعضاء ومزاج میں اعتدال وتناسب رکھا گیا ہے، یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ ایسی مخلوق مہمل و بے کار پیدا نہیں کی گئی، بلکہ (جب یہ خود معتدل ومتناسب پیدا ہوئی تو) اعتقاد وعمل کی معتدل وسیدھی راہ کو پہچاننے، اور اعتقاد وعمل کی غیر معتدل وٹیڑھی راہ سے بچنے کے لیے پیدا کی گئی ہے، اس لیے کہ غیر معتدل کو معتدل ہی پہچان سکتا ہے (**وبضدها تتبين الأشياء**)

چنانچہ طب کی کتابوں میں یہ قاعدہ لکھا ہے کہ غیر معتدل اس کیفیت سے جو اس کی ہم جنس نہ ہو اور اعتدال سے خارج ہو، متاثر نہیں ہوتا، اس کی بجائے اپنی ہم جنس کی تاثیر زیادہ قبول کرتا ہے اور تھوڑے کو زیادہ جانتا ہے۔

جب انسان نے اعتدال کی راہ پہچاننے میں کوتاہی کی، اور اللہ کی نافرمانی اختیار کی، تو وہ غضب وناراضگی کا زیادہ مستحق ہوا، لہٰذا کرم کی وجہ سے فریب کھانا چہ معنی دارد؟

فی ایّ صورۃ الخ میں ایک اشکال اور اس کا جواب:

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں نعمتوں کو شمار کرتے ہوئے ان کے درمیان حرف

عطف لائے ہیں، مگر فی ای صورۃ الخ میں حرفِ عطف ذکر نہیں کیا اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:- یہ ہے کہ خلق، تسویہ، اور تعدیل یہ تینوں فعل ترتیب سے بیان ہوئے ہیں اور ان کے درمیان تعقیب کی گنجائش ہے جو کہ فاء کا مدلول ہے، اس لیے ان کے درمیان فاء عاطفہ ذکر فرمائی، مگر ان کے بعد صورت کی ترکیب لازم ہے بلکہ تسویہ وتعدیل بعینہٖ تصویر (صورت گری) ہی ہے، لہٰذا یہاں حرف عطف کی گنجائش نہیں ہے (کہ عطف مغائرت کو چاہتا ہے اور یہاں تعدیل، تسویہ اور ترکیب صورت کے درمیان کوئی مغائرت نہیں) جب یہ نعمت یعنی صورت، تسویہ وتعدیل سے مل کر پیدا ہوئی تو اس کو ان دونوں نعمتوں کے بیان کے طور پر بغیر عطف ذکر فرمایا۔

فی ایّ صورۃ الخ کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال:

پہلا قول:- اس آیت کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ بچہ کبھی باپ کی شکل وصورت پر ہوتا ہے، کبھی ماں کے مشابہ، کبھی چچا یا ماموں کے مشابہ اور کبھی ان میں سے کسی کے مشابہ نہیں ہوتا، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی سے پوچھا "ما ولدک؟" تیری اولاد کیا ہے؟

اس نے عرض کیا "یا رسول اللّٰہ وما عسیٰ أن یولد في إما غلام أو جاریة" یعنی ابھی تک تو کچھ نہیں مگر امید ہے لڑکا پیدا ہوگا یا لڑکی، پھر آنحضرت ﷺ نے پوچھا "ممن تشبه" بچہ کس کے مشابہ ہوتا ہے، اس نے کہا "تشبه أمه أو أباه" بچہ ماں یا باپ کے مشابہ ہوتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

لا تقل هٰكذا، إن النطفة اذا استقرت فی الرحم أحضر اللّٰه كل نسب بينها وبين اٰدم، أما قرأت هذه الاٰية "فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّاشَاۗءَ رَكَّبَكَ"

یعنی یہ نہیں کہو، بلکہ نطفہ جب رحم میں ٹھہر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس نطفے اور آدم علیہ السلام کے درمیان جتنے نسب ہیں سب کو حاضر کرتا ہے، کیا تم نے یہ آیت نہیں پڑھی "فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّاشَاۗءَ رَكَّبَكَ"

دوسرا قول:- بعض نے کہا اس سے مراد خوبصورتی اور بدصورتی ہے، لوگوں کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں، بعض اچھی ہوتی ہیں اور بعض بُری ہوتی ہیں۔

تیسرا قول:- بعض نے کہا کہ اس سے انسانی صورتوں کا زیادہ ہونا مراد ہے، یعنی اللہ تعالیٰ

کی قدرت کے عجائبات میں سے ایک یہ ہے کہ طرح طرح کی بے شمار صورتیں پیدا کیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس قدر کروڑوں انسانوں کے چہرے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اس وقت تک علیحدہ پیدا کیے، باوجود اس کے کہ جسم وچہرے کے جن اعضاء سے صورت بنتی ہے مثلاً کان، آنکھ، ناک وغیرہ سارے انسانوں میں یکساں ہیں، لیکن پھر بھی ہر شخص کی شکل وصورت دوسرے سے جُدا ہے، یہاں سے اللہ تعالیٰ کے خزانوں کی لامحدود وسعت اور اس کے علم کی کثرت معلوم ہوتی ہے کہ کتنے بے انتہا نقشے اس کے خزانے میں موجود ہیں۔

چوتھا قول:-بعض نے کہا صورت سے مراد مذکر ومونث ہونے کے اعتبار سے مختلف ہونا ہے کہ مذکر یا مونث میں سے جو چاہا بنادیا، اس صورت میں آیت کا ربط پہلی آیتوں سے یہ ہوگا کہ مذکر کی تعدیل وتسویہ مونث کی تعدیل وتسویہ سے علیحدہ ہے، لیکن یہ اختلاف وفرق صرف صنفی اعتبار سے ہے ورنہ نفسِ تعدیل وتسویہ میں مذکر ومونث دونوں شریک ہیں، اور اسی صنفی فرق کی وجہ سے اطباء کہتے ہیں عورت کا مزاج تَر ہے اور مرد کا مزاج خشک ہے، اور جیسا کہ ذکر کردیا کہ نفسِ تعدیل وتسویہ جو نوع انسانی کا مقتضا ہے وہ دونوں میں مشترک ہے۔

پانچواں قول:-بعض نے کہا کہ اس سے رنگوں کا اختلاف مراد ہے، جیسا کہ پہلی اقلیم اور دوسری کے رہنے والے سیاہ رنگ کے ہوتے ہیں، اس لیے کہ سورج ہمیشہ ان کے اوپر ہوتا ہے یا ذرا ہٹا ہوا، اور مسلسل سورج کی گرمی پڑتی رہے تو رنگ سیاہ ہوجاتا ہے، جیسے دھوبیوں اور دھوپ کے اندر ننگے کام کرنے والے دیہاتیوں میں اس کا مشاہدہ ہے کہ وہ کالے ہوجاتے ہیں۔

اور تیسری اقلیم کے رہنے والے اکثر گندم گوں ہوتے ہیں، اور چوتھی اقلیم کے رہنے والے گورے مائل سرخی ہوتے ہیں، پانویں اقلیم کے رہنے والے سرخ رنگ ہوتے ہیں اور چھٹی، ساتویں اقلیم کے رہنے والے زرد رنگ ہوتے ہیں۔

چھٹا قول:-حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ بعض کو ایسی صورت پر پیدا کیا کہ ان کو خاص اپنی بندگی کے لیے چُن لیا، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

"وَاصْطَنَعْتُکَ لِنَفْسِیْ" "اور تم کو اپنے لیے منتخب کرلیا" اور دوسرے انبیاء کے بارے میں بھی فرمایا "اِنَّهٗ کَانَ مُخْلَصًا" وَاِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْن"

یہ گروہ بادشاہ کے خاص مقربین کی طرح ہے جو خاص خاص خدمات پر مامور ومقرر ہوتے ہیں، لیکن ان کے مقابلے میں بعض کو ایسی صورت پر پیدا کیا کہ وہ اس کے غیر میں مشغول ہیں، جیسے بعض تجارت ومال میں بعض کھیتی باڑی میں اور بعض دیگر دنیوی کاموں میں مشغول ہیں تاکہ دنیا کا نظام چلے۔

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۝

ہرگز نہیں پر تم جھوٹ جانتے ہو انصاف کا ہونا

گذشتہ آیت میں سوال کے انداز میں جو سرزنش آئی ہے اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی صفتِ کریمی کا ذکر ہے، اس بات کا گمان تھا کہ یہ سن کر کہیں کافر یہ نہ کہنے لگ جائیں کہ ہمارا غرور واعتماد تو اللہ کے کرم پر تھا، اس لیے دوسری تنبیہ پہلی سرزنش سے زیادہ سخت ارشاد فرمائی، فرمایا "کـلا" ہرگز ایسا نہیں ہے کہ تم اس کے کرم پر اعتماد کرتے ہوئے گناہ کرتے ہو، یہ اعتماد جب ہوتا کہ تم آخرت کی جزاء کا اعتقاد رکھتے ہوتے حالانکہ تمہارا یہ اعتقاد نہیں ہے۔

"بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ" بلکہ تم تو جزا کا انکار کرتے ہو، حالانکہ جزا کا وعدہ بھی اسی کا کرم ہی ہے تاکہ اچھی جزا کی امید پر تم فرمانبرداری اختیار کر کے دین ودنیا کے سارے کاموں کو بنالو، اور عذاب کے خوف سے نافرمانی وگناہ کی زندگی سے باز آؤ اور دونوں جہاں کے کام بگڑنے سے بچالو۔

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝

اور تم پر نگہبان مقرر ہیں

یعنی جزاء کا انکار تم سے کس طرح بن پڑے گا، حالانکہ تم پر نگران مقرر ہیں، تاکہ تمہارے اچھے برے کاموں کی خبر گیری کریں، نہ تمہاری کوئی نیکی ضائع ہو نہ برائی رائیگاں جائے۔

كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝

عزت والے عمل لکھنے والے

"کراما" یعنی وہ نگران وچوکیدار بھی حق تعالیٰ کی صفت کے موافق تم سے کرم کا معاملہ کرتے ہیں۔

انسانوں کے ساتھ کراماً کاتبین کے کرم ومہربانی کی صورتیں:

کراماً کاتبین کی ایک مہربانی تو یہ ہے کہ وہ تمہاری آنکھوں سے غائب رہتے ہیں، تمھارے سامنے ظاہر نہیں ہوتے، ورنہ تم اپنی عورتوں کے پاس جانے، بیت الخلاء جانے سے شرم محسوس کرو اور لذت کی چیزوں کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو جاؤ۔

اور ان کے کرم ومہربانی میں سے یہ بھی ہے کہ تمہیں رسوا نہیں کرتے، تمھارے راز دوسروں کے سامنے بیان نہیں کرتے۔

یہ بھی ان کا کرم ہے کہ جب تم کوئی ایک نیکی کرتے ہو تو وہ اس کو دس گنا بڑھا کر لکھتے ہیں، جیسے ایک روپیہ اگر تم اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہو تو اس کو دس روپے لکھتے ہیں، اور اگر کبھی تم نے کسی نیکی کا ارادہ کیا مگر تم کر نہ سکے تو فرشتے اس ارادہ کو بھی نیکی ہی لکھتے ہیں، اور اگر کبھی تم نے گناہ کا ارادہ کیا پھر چھوڑ دیا، نہ کیا، تو وہ اس چھوڑنے کو بھی نیکی لکھتے ہیں، اور اگر تم سے کبھی گناہ سرزد ہو جائے، تو چھ ساعت تک وہ اس کو نہیں لکھتے، اس انتظار میں رہتے ہیں کہ شاید تم توبہ کرلو، استغفار کرلو، یا اس کے بعد کوئی ایسی نیکی کرلو جو اس گناہ کو مٹا دے، اور جب اتنے عرصے میں اس گناہ کا کوئی تدارک نہیں کرتے تو اس وقت وہ ایک گناہ لکھ لیتے ہیں، پھر جب تم توبہ کر لیتے ہو یا اس گناہ کو مٹانے والی کوئی نیکی، تو اس لکھے ہوئے کو مٹا دیتے ہیں، اور وہ نگران تمہارے کاموں کو یاد رکھنے میں بہت احتیاط کرتے ہیں، فرشتہ ہونے کی وجہ سے ان کے اندر بھول جانے کا مادہ نہیں، مگر اس کے باوجود ''کاتبین'' وہ لکھ رکھتے ہیں، اپنی یاد پر اعتماد نہیں کرتے۔

دن رات میں انسان کے نگراں فرشتے:

صحیح روایات کے مطابق ہر آدمی کے اعمال لکھنے والے چار فرشتے ہیں، دو دن کے اور دو رات کے ہوتے ہیں، ہر دن ورات کے لکھے ہوئے رجسٹر الگ چھوڑتے ہیں، بعض روایات میں آتا ہے کہ ان دونوں کے بیٹھنے کی جگہ انسان کے دونوں کندھے ہیں، اور بعض نے کہا کہ ان کے بیٹھنے کی جگہ ہر آدمی کے اوپر کے دو بڑے دانت ہیں، انسان کی زبان ان کا قلم اور تھوک ان کی سیاہی ہے۔

اور جب دن رات کا یہ دفتر حق تعالیٰ کے حضور لے جاتے ہیں، تو باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، ان کو حکم ہوتا ہے کہ اس لکھے ہوئے کا لوح محفوظ کے ساتھ مقابلہ کرلو، اس لیے کہ بندہ جو کچھ کرے گا وہ سب کچھ بغیر ادنیٰ کمی زیادتی کے لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا

ہے، جب وہ مقابلہ کر لیتے ہیں تو حکم ہوتا ہے نیکی اور گناہ کے سوا جو کچھ ہے سب مٹا دو، صرف نیکی اور گناہ رہنے دو اس پر اس کو ثواب وعذاب ہوگا۔

يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝

جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو

یعنی ان نگرانوں سے تمہارے حالات پوشیدہ نہیں ہیں، یہ بھی مت گمان کرنا کہ جس طرح دنیا کے اخبار نویسوں، اور خفیہ نویسوں سے کسی حیلہ ومکر سے اپنا کام چھپا رکھتے ہو، ان سے بھی چھپا رکھو گے، اس لیے کہ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو اگر چہ ہزار پردے کے اندر تم کرو۔

فرشتوں کا آدمی کے اعمال وتروک اور نیات پر مطلع ہونا:

اب یہ سمجھ لینا چاہئے کہ نگراں فرشتوں کا انسان کے افعال پر مطلع ہونا اس آیت (يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ) سے ثابت ہوا، اور اقوال پر اطلاع سورۂ قاف کی اس آیت سے ثابت ہوتی ہے ''مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ'' اور ان کا تروک پر مطلع ہونا یعنی کسی کام کے چھوڑ دینے پر جیسے روزہ، اعتکاف، یا مثلاً احرام میں جو چیزیں ممنوع ہیں ان کا چھوڑنا یا اس طرح کی جو بھی چیزیں ہیں ان پر مطلع ہونا دلیل عقلی سے ثابت ہے، اس لیے کہ حاجت وضرورت کے وقت بغیر کسی عذر ومانع کے کوئی کام نہیں کیا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ یہ کام چھوڑ دیا۔

لیکن فرشتوں کا نسان کی نیتوں کا حال معلوم کرنا، اور دل میں چھپی بات پر مطلع ہونا، اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے، اکثر علماء نے کہا ہے کہ فرشتوں کو دل کی بات کی خبر نہیں ہوتی، مگر صحیح حدیث میں وارد ہے کہ لکھنے والے فرشتے نیکی کے ارادے کو اور برائی چھوڑ دینے کے ارادے کو نیکی لکھتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو دل کی باتوں پر اطلاع ہے، جو علماء اس کا انکار کرتے ہیں وہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ اطلاع فرشتوں کو خود سے نہیں ہو جاتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو الہام ہوتا ہے کہ فلاں بندے نے دل میں نیکی کا ارادہ کیا ہے یا گناہ کا ارادہ کر کے پھر چھوڑنے کا ارادہ کیا ہے، اس کی ایک نیکی لکھ لو، وھو الأظھر۔

جب بات یوم آخرت کی جزاء تک آ گئی تو اب ضروری ہوا کہ نیک اور فرمانبرداروں کے ثواب اور بدکاروں، نافرمانوں کے عذاب وسزا کا بھی ذکر کر دیا جائے، چنانچہ فرمایا:

اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِیۡ نَعِیۡمٍ ○ وَاِنَّ الۡفُجَّارَ لَفِیۡ جَحِیۡمٍ ○

بیشک نیک لوگ بہشت میں ہیں اور بیشک گنہگار دوزخ میں ہیں

یعنی نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے اور بُرے دوزخ میں ہوں گے۔

یَّصۡلَوۡنَهَا یَوۡمَ الدِّیۡنِ ○ وَمَا هُمۡ عَنۡهَا بِغَآئِبِیۡنَ ○

ڈالے جائیں گے اُس میں انصاف کے دن اور نہ ہوں گے اُس سے جُدا ہونے والے

فرمایا وہ اس سے غائب ہونے والے نہ ہوں گے، حاصل اس کا یہ ہے کہ وہاں ایسا نہیں ہوگا جس طرح دنیا میں ہوتا ہے کہ کوئی مصیبت آ جائے تو اس سے بھاگ کر یا چھپ کر جان بچا سکتے ہیں، وہاں ایسا کوئی حیلہ ومکر نہ چل سکے گا، اس بلا سے ان کی گلوخلاصی نہیں ہو سکے گی، اس لیے کہ اس آگ کی لپک دور دور سے بدکاروں کو کھینچ کر اپنے اندر لے آئے گی اور دوزخ کے دروازوں پر کھڑے فرشتے ان کو زنجیروں، طوقوں میں باندھ کر دوزخ میں ڈال دیں گے، وہاں سے نہ بھاگنے کی گنجائش ہوگی نہ مقابلے کی طاقت۔

''غائبین'' کی تفسیر میں دوسرا قول:

بعض مفسرین نے غائب نہ ہونے سے مراد ''عدم الاخراج'' لیا ہے، یعنی ''فجار'' اس سے غائب نہ ہوں گے سے مراد یہ ہے کہ وہاں سے کبھی بھی نکالے نہیں جائیں گے، اس قول کے مطابق ''فجار'' سے مراد خاص طور پر صرف کفار ہوں گے، اس لیے کہ اہلِ ایمان گنہگار تو ضرور جہنم سے نکالے جائیں گے۔

فنونِ بلاغت کے نکات:

علمِ بدیع کے ماہرین نے کہا ہے کہ اس کلام میں صفتِ جمع اور صفتِ تقسیم ہے [۱]

یعنی پہلے ''اِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ'' فرمایا، اس میں انسان کے تمام افراد کو خواہ وہ نیک ہوں یا برے ایک حکم میں جمع کر دیا، پھر اس کے بعد جزا بیان کرتے ہوئے ہر ایک کی الگ الگ جزا بیان

---

(۱) علم البدیع کی اصطلاح میں صفتِ جمع کہتے ہیں کلام میں امورِ متعددہ کو ایک حکم میں جمع کر دینا، اور صفتِ تقسیم کی بہت سی قسمیں ہیں ان میں سے ایک قسم یہ ہے کہ پہلے امورِ متعددہ کو ذکر کریں پھر ان میں سے ہر ایک کے کوئی مناسب بات متعین کر کے اس کی طرف منسوب کر دی جائے۔ (کذا فی دروس البلاغۃ ص ۹۶/ ۹۷) سفیر احمد

فرمادی، یعنی "ان الابرار لفی نعیم ۝ وان الفجار لفی جحیم "

اوراس کلام میں صفتِ ترصیع بھی ہے، علم بدیع کی اصطلاح میں جس کلام میں یہ صفت پائی جاتی ہے اس کو "مرصع" کہتے ہیں۔ کلام مرصع وہ ہوتی ہے جس کے دو یا زیادہ فقروں کے الفاظ وزن اور سجع میں برابر ہوں (سجع سے مراد یہاں قافیہ ہے) یعنی وزن بھی ایک ہو اور آخری حرف بھی، اور اس کلام میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں، ابرار، فجار کا ہم وزن وہم قافیہ ہے اور نعیم، جحیم، کے ہم وزن وہم قافیہ ہے، اسی صفتِ ترصیع کو کسی شاعر نے اس شعر میں جمع کیا ہے ؎

اے منور بتو نجومِ جلال
وی مقرر بتو رسوم کمال

اس شعر میں یہ الفاظ ہم وزن وہم قافیہ ہیں، منور، مقرر، نجوم، رسوم، جلال، کمال۔

اوراس کلام میں صفت تضاد بھی پائی جاتی ہے، اس کو طباق اور تطبیق بھی کہتے ہیں، اس صفت کا مطلب یہ ہے کہ کئی متضاد چیزوں کو ایک جگہ جمع کر دینا جیسا کہ اس شعر میں ہے ع

ہشیار دروں رفت بروں آمد مست

اس آیت میں بھی نعیم، جحیم کی ضد ہے اور ابرار، فجار کی ضد ہے۔

وَمَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ۝

اور تجھ کو کیا خبر ہے کیسا دن ہے انصاف کا

گذشتہ آیات میں کفار کی جزا بیان کرتے ہوئے درمیان میں انصاف کے دن کا ذکر آ گیا تھا: (بَلْ تُکَذِّبُوْنَ بِالدِّیْنِ) وہاں اس دن کی سختیاں، شدائد اور ہولناکیاں خاطر خواہ بیان نہیں ہوئی تھیں، اس لیے مناسب ہوا کہ اب اس دن کی کچھ سختیاں بیان کی جائیں، چنانچہ اجمالی طور پر استفہام تہویلی کے ساتھ بیان فرماتے ہیں کہ "تم کیا جانو انصاف کا دن کیا ہے"۔ اس کلام کا حاصل یہ ہے کہ اس دن کی مصیبتیں، سختیاں کوئی انسان اپنی عقل کے ذریعے معلوم نہیں کرسکتا، اس لیے کہ دنیا میں کیسی ہی مصیبتیں، پریشانیاں اور تکلیفیں کسی پر گذری ہوں یا کسی سے سنی ہوں، ان سارے مصائب کی اس دن کی سختیوں کے سامنے کوئی حقیقت نہیں ہے، لہٰذا عقل کے ذریعہ قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ اس دن کے مصائب کا کیا عالم ہوگا۔

ثُمَّ مَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ؁

پھر بھی تجھ کو کیا خبر ہے کیسا دن ہے انصاف کا
یعنی ہم مہلت کے بعد پھر کہتے ہیں ''تم کیا جانو انصاف کا دن کیا ہے''

ثم کا فلسفہ:

اس مقام پر ''ثم'' کا حاصل یہ ہے کہ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کو سنتے ہی آدمی اس کی حقیقت سمجھ نہیں پاتا، البتہ کچھ دیر غور وفکر کرنے کے بعد بات سمجھ میں آجاتی ہے، لیکن جو چیزیں ایسی ہوں کہ وہم وخیال میں اس کی گنجائش ہی نہ ہو تو ایسی چیزوں پر مدتوں غور وفکر کے لیے سر کھپانا یا سنتے ہی اس کی حقیقت سے آگاہ ہونے سے مایوس ہو جانا دونوں برابر ہے، اسی لیے فرمایا کہ مہلت وفرصت کی مدتِ دراز کے بعد بھی حقیقتِ حال سے واقف نہ ہوسکو گے، مگر ہم خود اس دن کی شدت وہولنا کی تھوڑی سی بیان کر دیتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا ؁

جس دن کہ بھلا نہ کر سکے کوئی جی کسی جی کا کچھ بھی

اب یہاں سے اس دن کی شدت وسختی سمجھنے کے لیے پہلے یوں غور کریں کہ دنیا میں اگر کسی پر کوئی مصیبت یا پریشانی آجائے تو وہ کیا کرتا ہے، عام دستور یہ ہے کہ آدمی اس پریشانی سے خلاصی حاصل کرنے کے لیے پہلے عوام الناس کی طرف رجوع کرتا ہے، لیکن جب وہاں سے کوئی حل نہیں نکلتا تو وہ خواص کی طرف رجوع کرتا ہے، مثلاً مصیبت کا تعلق اگر بیماری سے ہے تو وہ ماہر طبیبوں کے پاس جاتا ہے، اگر مصیبت کا تعلق ظلم وجبر کے ساتھ ہے تو عادل حکام کی طرف رجوع کرتا ہے، اگر خواص سے مقصد بر آری میں دشواری ہو رہی ہو وہ اس کے حال کی طرف توجہ نہ دے رہے ہوں، تو پھر وہ ان خواص کے دوست احباب سے سفارش کرواتا ہے تاکہ اس کی مشکل دور ہو سکے، لیکن اس دن سارے رشتے، سارے تعلقات نیست ونابود ہو جائیں گے، سوائے نفسی نفسی کے کسی کو کسی کے حال پر کوئی شفقت وہمدردی نہ ہوگی، ماں باپ کو اپنی اولاد پر رحم ہوگا نہ اولاد کو والدین کا کچھ غم، سب اپنے حال میں گرفتار ہوں گے، وہاں کے مقدمات میں کسی ادنیٰ یا اعلیٰ کو کوئی دخل نہ ہوگا، خواص بھی عوام کی طرح

حیران و پریشان ہوں گے، بڑے بڑے سردار عام لوگوں کی طرح سرگشتہ بدحواس ہوں گے، اس دن مالک الملک کی اجازت کے بغیر خود سے کوئی سفارش کی جرأت نہ کر سکے گا، عاجزی و چاپلوسی، یا صبر واستقلال سب بے کار، اس دن جس پر ارحم الراحمین رحم فرمائے وہی نجات پائے گا، اور جس پر اس کا غضب ہو گیا اس کے لیے بربادی و رسوائی ہے، العیاذ باللہ۔

آیت میں تین عموم:

اس آیت میں تین عموم ہیں:

(۱) نفسِ مالک (لا تملک نفس) (یعنی کوئی نفس مالک نہ ہوگا)

(۲) نفس مملوک (لنفس) (کوئی نفس مملوک نہ ہوگا کسی بھی درجے میں یعنی حاجت براری کی حد تک بھی کوئی کسی کا ماتحت نہ ہوگا)

(۳) شئ مملوک (شیئاً) ان تینوں عموم سے انتہائی درجے کی مایوسی ثابت ہوئی کہ اس دن کوئی کسی کی کچھ بھی چارہ جوئی نہ کر سکے گا۔

وَالۡاَمۡرُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰہِ ۝

اور حکم اس دن اللہ ہی کا ہے

جس طرح بادشاہ کا حکم رعایا پر، والدین کا اولاد پر، آقا کا نوکر پر، خاوند کا بیوی پر چلتا ہے، اس دن یہ سارے حکم ختم ہو جائیں گے سوائے مالک مطلق کے کسی میں دم مارنے کی ہمت نہ ہوگی، جس کو مالک نے ہر طرح سے پسند کر لیا اس کی نجات ہے، جس کو مالک نے ہر طرح سے ناپسند کر لیا وہ برباد ہوا، اور جس میں کچھ پسندیدہ باتیں تھیں اور کچھ مالک کی ناپسندیدہ باتیں تو ایسوں کے بارے میں انبیاء، اولیاء، علماء، شہداء، حفاظ اور فرشتوں کو حکم ہوگا کہ تم سفارش کرو تا کہ تمہاری بھی عزت افزائی ہو جائے، ایسی سفارش جو حاکم کے حکم پر موقوف ہو اس میں کسی کا دخل ہوتا ہے نہ اس پر بھروسہ کرنا چاہئے، اس مضمون سے معلوم ہو گیا کہ اس آیت میں شفاعت کی نفی نہیں جیسے معتزلہ نے کہا، بلکہ شفاعت کو حاکم کے حکم پر موقوف رکھا ہے، یہی اہل سنت والجماعت کا صحیح مذہب اور عقیدہ ہے۔

واللہ اعلم بالصواب الحمد للہ

الازہار المربوعہ
(مسلسل)

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

میں نے اعلام ص ۱۹ میں اجلّہ محدثین کا فیصلہ یہ بتایا ہے کہ حضرت رکانہ نے لفظ بتہ سے طلاق دی اور اس کے ثبوت میں لکھا ہے کہ امام ترمذی یا بخاری نے فرمایا کہ **اصحها انه طلقها البتة وان الثلث ذكرت فيه على المعنى**، یعنی صحیح تر بات یہ ہے کہ رکانہ نے لفظ بتہ سے طلاق دی اور تین کا ذکر روایت بالمعنی ہے۔

صاحب آثار لکھتے ہیں ناظرین یقین مانیں کہ نہ تو یہ امام بخاری کا مقولہ ہے نہ امام ترمذی کا بلکہ یہ منذری کا مقولہ ہے (الی) امام بخاری تو بتہ والی روایت کے متعلق فرماتے ہیں۔۔۔۔کہ علی بن یزید بن رکانہ کی حدیث صحیح نہیں ہے اور تلخیص میں ہے کہ بخاری نے اس کو اضطراب کی وجہ سے معلول قرار دیا ہے۔ اب مولف کی اس حیرت انگیز غلط نوازی کو کیا کیا جائے کہ بخاری تو بتہ والی روایت کو غلط قرار دیں لیکن مولف ان کی طرف بتہ والی روایت کی صحت کی نسبت کریں (آثار ص ۴۸ و ۴۹ باختصار)

جواب: — مجیب نے یہاں پر بھی مصری مولوی صاحب کے رسالہ القول الجامع کو میرے رسالہ کا ماخذ قرار دیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ ''انھوں نے اس قول کو بخاری کی طرف منسوب کیا ہے اور مولف اعلام نے ان کی صریح غلط بیانی پر پردہ ڈالنے کے لیے ترمذی کا نام بھی شامل کر دیا ہے''، لیکن یہ سب مجیب کے فاسد خیالات ہیں، میں پہلے بتا چکا ہوں کہ نہ القول الجامع میرے رسالہ کا ماخذ ہے نہ میں نے اب تک اس کو دیکھا ہے، اس لیے اب کچھ لکھنا فضول سمجھتا ہوں۔ ہاں کوئی مجیب سے اتنا پوچھے کہ جب یہ قول منذری کا ہے اور مصری نے بخاری کا قول بتایا ہے تو بخاری کے ساتھ ترمذی کا نام شامل کر دینے سے مصری صاحب کی غلط بیانی (مزعومۂ مجیب) پر پردہ کیسے پڑ سکتا ہے، افسوس ہے کہ

مجیب صاحب کو اتنی بھی سمجھ نہیں ہے۔ ہاں مجیب نے مجھے یہ طعنہ بھی دیا ہے کہ جب مولف کو یہ بھی پتہ نہیں کہ یہ کس کا قول ہے تو ناحق امام بخاری کا نام لے کر ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کیوں کرتے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ اعلام لکھنے کے وقت تک مجھ کو تردد تھا کہ یہ قول ترمذی کا ہے یا بخاری کا اس لیے از راہ دیانت میں نے اس تردد کو ظاہر کر دیا، جیسا کہ اہل علم کا شیوہ ہے۔ اگر مجیب کی طرح مجھ کو جھوٹی شہرت کی خواہش ہوتی اور انجام آخرت سے بھی بے خوف ہوتا تو یہ بہت آسان بات تھی کہ کسی ایک ہی نام کو تعیین کے ساتھ لکھ دیتا، لیکن اب بہت غور وفکر کے بعد میرے نزدیک یہی راجح ہے کہ یہ قول امام بخاری کا ہے اور مجیب کا یہ لکھنا کہ یہ منذری کا مقولہ ہے بالکل غلط ہے، اس لیے کہ تعلیق مغنی کی جس عبارت کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے اس مقولہ کو نقل کیا ہے اس میں منذری کا نام کہیں بھی نہیں آیا ہے بلکہ وہ عبارت صرف اتنی ہے: **وذكر الترمذي عن البخاري انه يضطرب فيه تارة يقال فيه ثلاثاً وتارة قيل واحدة وأصحها أنها طلقها البتة وأن الثلٰث ذكرت فيه على المعنى** یعنی ترمذی نے بخاری سے نقل کیا ہے کہ اس روایت میں اضطراب واقع ہوتا ہے کبھی ثلاثاً کہا جاتا ہے کبھی واحدۃ اور صحیح تر بات یہ ہے کہ رکانہ نے بتہ طلاق دی اور تین کا ذکر روایت بالمعنی ہے۔

ناظرین تعلیق مغنی ص ۴۳۹ میں اس عبارت کو پڑھیں اور اس کے آگے اور پیچھے بھی پڑھ جائیں اور دیکھیں کہ منذری کا نام کہاں آیا ہے، میں مجیب صاحب کو بھی چیلنج دیتا ہوں کہ وہ تعلیق مغنی میں اس مقام پر منذری کا نام کہیں بھی دکھا دیں تو ان کو دار قطنی کا ایک نسخہ انعام دیا جائے گا اور اگر یہ نہ کر سکیں تو علانیہ اپنی غلط بیانی کا اعتراف کریں۔

اس کے بعد مجیب کو بتانا چاہتا ہوں کہ یہ عبارت بعینہ اسی طرح نیل الاوطار ج ۶، ص: ۱۵۰ میں بھی موجود ہے اور وہاں پر بھی منذری کا نام کہیں نہیں آیا ہے، اسی طرح یہ عبارت ابوداؤد مطبوعہ اصح المطابع ج ا ص ۲۱۹ کے حاشیہ پر بھی موجود ہے اس میں بھی منذری کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ پس آپ کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ یہ مقولہ منذری کا ہے۔

باقی رہا آپ کا ص ۴۹ میں یہ کہنا کہ تعلیق مغنی ص ۴۵۰ میں یہ صریح عبارت موجود ہے **قال المنذري وأصحها انه طلقها البتة وأن الثلٰث ذكرت على المغنى** تو گزارش ہے کہ اولاً

تعلیق ص۴۵۰ میں **و اصحھا** نہیں ہے بلکہ **و اصحہ** ہے، مہربانی کر کے ایسی خیانت وابلہ فریبی سے باز آیئے۔

ثانیاً: – یہ کہ **قال المنذری** آپ کے حضرت مولانا ڈیانوی کا اضافہ ہے، اس کی لاجواب دلیل یہ ہے کہ مولانا مبارک پوری نے تحفۃ الاحوذی ج۲ ص۲۱۰ میں یہی عبارت نقل کی ہے اور اس میں **قال المنذری** کا لفظ موجود نہیں ہے۔ اسی طرح عون المعبود ص...... میں خود آپ کے حضرت مولانا ڈیانوی نے یہی عبارت نقل کی ہے اس میں بھی یہ اضافہ ندارد ہے۔

اصل یہ ہے کہ مولانا ڈیانوی کو بھی مجیب کی طرح امام بخاری کا بتہ کو اصح کہنا بہت شاق گزرا، اس لیے انھوں نے **قال المنذری** کا اضافہ کر کے اس کو منذری کا قول بنا دیا تا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری، اور اس کاروائی کے وقت ان کو یہ بھی خیال نہ رہا کہ اس سے پہلے بھی وہ اس عبارت کو لکھ چکے ہیں اور وہاں اس اضافہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ناظرین دیکھیں کہ مذہبی تعصب انسان سے کیا کیا کراتا ہے، خیر مولانا ڈیانوی کے بعد ہمارے مجیب آئے اور یہ خیال کر کے کہ جب مولانا ڈیانوی نے اس کو منذری کا مقولہ لکھ دیا ہے تو اب اس کی واقعیت میں شبہہ کی کون سی گنجائش ہوسکتی ہے، آنکھ بند کر کے لکھ دیا کہ یہ منذری کا مقولہ ہے اور یہ نہیں سوچا کہ وہی مولانا ڈیانوی ص۴۳۹ میں اس عبارت کو بلا اضافۂ **قال المنذری** لکھتے ہیں، اور وہاں پر منذری کا نام بھی کہیں نہیں آیا ہے۔ پس یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ جو عبارت وہ **ذکر الترمذی عن البخاری** کے عنوان سے لکھتے ہیں اس میں کچھ حصہ تو بخاری کا مقولہ ہو اور کچھ بلا دلیل و بلا قرینہ منذری کا ہو جائے۔

بہر حال اس کو منذری کا مقولہ کہنا بالکل بے دلیل وغلط بات ہے۔ صحیح یہ ہے کہ وہ بخاری کا مقولہ ہے۔ اس لیے کہ **و اصحھا** سے پہلے جو فقرہ ہے وہ بالاتفاق بخاری کا مقولہ ہے، پس جو فقرہ **و اصحھا** سے شروع ہوتا ہے چونکہ اس کے شروع ہونے سے پہلے کوئی لفظ یا رمز ایسا نہیں ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہو کہ یہاں سے دوسرے قائل کا مقولہ شروع ہوتا ہے لہذا یہ فقرہ بھی بخاری ہی کا ہے۔

اب رہا مجیب کا یہ اجتہاد کہ جب بخاری اس روایت کو اضطراب کی وجہ سے معلول کہتے ہیں تو

وہ اس کو صحیح کیونکر کہہ سکتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ امام بخاری کی جانب اس کو صحیح کہنے کی نسبت نہیں کی گئی ہے بلکہ ثلاثاً اور بتہ میں بتہ کو اصح کہنے کی نسبت کی گئی ہے اور ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے، جس کو چاہے مجیب نہ سمجھ سکتے ہوں لیکن اہل علم اس فرق سے آگاہ ہیں۔ اس کے علاوہ علماء یہ بھی جانتے ہیں کہ بسا اوقات محدثین صورتِ اضطراب پر اضطراب کا لفظ بول دیتے ہیں اور ان کی مراد حقیقت اضطراب نہیں ہوتی، چنانچہ حافظ ابن حجر نے مقدمہ ص...... میں بخاری کی ایک حدیث کی نسبت دارقطنی کا یہ قول کہ "یہ حدیث مضطرب ہے" نقل کر کے لکھا ہے کہ دارقطنی نے محض اختلاف پر اضطراب کے لفظ کا اطلاق کر دیا حالانکہ یہاں جمع کا امکان موجود ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اضطراب کا اطلاق صورتِ اضطراب پر بھی کر دیا جاتا ہے، پس اسی طرح یہاں بھی امام بخاری کے کلام میں یضطرب فیہ یا فیہ اضطراب سے مراد صورت اضطراب یا مطلق اختلاف ہے جو ان کے اگلے فقرہ و اصحہا الخ کے منافی نہیں ہے، اور ان کی پوری عبارت کا حاصل یہ ہے کہ اس حدیث کے الفاظ مختلف ہیں مگر ان میں بتہ کا لفظ اصح ہے۔

صاحب آثار سے ایک سوال:- آپ کا دعوی ہے کہ امام بخاری نے بتہ والی روایت کو اضطراب کی وجہ سے معلول اور غلط کہا ہے اور اس اضطراب کی تفصیل خود بخاری نے یہ کی ہے کہ کبھی اس حدیث میں ثلاثاً کہا جاتا ہے اور کبھی واحدۃ اور کبھی بتہ جیسا کہ تعلیق ص ۴۵۰ اور زاد المعاد ص ۱۸۲ میں منقول ہے۔ پس میرا چیلنج ہے کہ آپ اور آپ کے بنارسی اعوان حدیث بتہ میں اس اضطراب کو ثابت کریں اور بتائیں کہ حدیث بتہ کے کس طریق میں ثلاثاً یا واحدۃ مذکور ہوا ہے، اگر فرمائیں کہ ابن اسحاق اور ابن جریج کی روایتوں میں ثلاثاً وارد ہوا ہے تو سوال ہے کہ اچھا واحدۃ کہاں وارد ہوا ہے؟ اور کیا ابن جریج اور ابن اسحاق کی روایتیں بھی حدیث بتہ ہی کے طرق ہیں؟ اگر کہئے کہ ہاں تو ارشاد ہو کہ جب کسی حدیث کے مختلف طرق میں اضطراب پیدا ہو جائے تو کیا اس کے بعض طرق قابل استدلال اور بعض ناقابل استدلال اس اضطراب کے ہوتے ہوئے ہو سکتے ہیں، اگر کہئے کہ ہاں تو آپ نے اس پر تعجب کیوں کیا کہ جب بخاری مضطرب کہتے ہیں تو اصحہا الخ کیسے کہہ سکتے ہیں اور اگر کہئے کہ نہیں تو آپ نے ابن اسحاق کی حدیث سے استدلال کیوں کیا؟

علاوہ بریں اگر ابن جریج کی روایت بھی حدیث بتہ ہی کا ایک طریق ہے، تو اس میں بھی اسی

شخص کا واقعہ مذکور ہوگا جس کا نافع وغیرہ کے طریق میں مذکور ہے، پس آپ نے ص ۵۱ میں دو شخصوں کا واقعہ کیوں لکھا؟ اور اگر دونوں میں دو شخصوں کے واقعے مذکور ہیں تو بتایا جائے کہ دو واقعوں میں جو اختلاف ہو اس پر اضطراب کی تعریف کیونکر صادق آتی ہے؟ مجیب صاحب ان باتوں کا مفصل جواب دیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو ناظرین پر اچھی طرح کھل جائے کہ اپنے مذہب کے پاس میں انھوں نے کیا کیا کارروائیاں کی ہیں، مجھے حیرت ہے کہ مجیب صاحب نے جہاں حدیث بتہ کے متنی اضطراب کی تفصیل کی ہے وہاں امام بخاری کے بیان کیے ہوئے اضطراب کو کیوں ہضم کر گئے ہیں۔ اور اس کو ثابت کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی ہے؟ ناظرین مجیب صاحب کے جواب کا انتظار کریں، لیکن میں ان کو اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ امام بخاری نے حدیث بتہ میں اضطراب نہیں بیان کیا ہے، بلکہ ان کا مقصود قصۂ رکانہ میں اضطراب ثابت کرنا ہے اور رکانہ کا قصہ جن روایتوں میں بیان ہوا ہے وہ سب اس اضطراب کی لپیٹ میں آ گئے ہیں، پس اگر بخاری کے دعویٰ اضطراب سے رکانہ کی روایت معلول قرار دی جائے گی، تو ابن اسحاق والی روایت کو بھی معلول کہنا پڑے گا ورنہ بخاری کا دعویٰ اضطراب ثابت نہ ہو سکے گا۔

اب رہا بخاری کا قول **علی بن یزید بن رکانة لم یصح حدیثه**، تو اولاً یہ قول علی ابن یزید کے طریق کے ساتھ مخصوص ہے اور اس طریق کے غیر صحیح ہونے سے نافع کے طریق کا غیر صحیح ہونا لازم نہیں آتا، پس بخاری کے دونوں قول کا متعارض نہ ہونا بالکل ظاہر ہے، اور وہ یوں کہ انھوں نے حدیث رکانہ کے ایک طریق کو غیر صحیح کہا ہے، لیکن چونکہ یہ حدیث اسی ایک طریق سے مروی نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے صحیح طریق سے بھی مروی ہے اور ان دونوں طریقوں میں بتہ کا لفظ واقع ہوا ہے، اس لیے انھوں نے بتہ کو اصح بھی کہا ہے، علاوہ بریں اصح کی مراد اصح الضعیفین بھی ہوتی ہے جیسا کہ ابن القیم نے اغاثہ میں اور ان کے حوالہ سے مولانا ڈیانوی نے تعلیق مغنی میں لکھا ہے اور خود مجیب نے ص ۵۲ میں اس کو بیان کیا ہے۔ نیز یہ بات بھی ہے کہ بخاری کا قول **لم یصح حدیثه** سند سے متعلق ہے اور **أصحها** متن سے متعلق ہے، پس اب تعارض کا کیا احتمال، اسی جگہ سے مولانا ڈیانوی کے اس کلام کی سخافت بھی ظاہر ہو جاتی ہے جو انھوں نے بتہ کو اصح کہنے والے کے جواب میں ذکر کیا ہے، اس لیے کہ جب انھوں نے اصح کا اصح الضعیفین کے معنی میں مستعمل ہونا خود ہی ذکر کیا ہے، تو کیوں نہیں

ہوسکتا کہ بخاری یا جس نے بتہ کو اصح کہا ہے اس کی مراد یہ ہو کہ ثلاثاً اور بتہ والی روایتیں ضعیف ہیں، لیکن ان دونوں میں بہتر و اصح بتہ والی روایت ہے۔

ثانیاً: — مجیب کی زبان میں کہا جاسکتا ہے کہ جب بقول مولانا ڈیانوی منذری نے امام احمد وغیرہ سے حدیث بتہ کی تضعیف نقل کی ہے تو وہ اس کو اصح کیونکر کہہ سکتے ہیں، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقولہ منذری کا نہیں ہے بلکہ بخاری کا ہے۔

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

اور امام ابوداؤد نے سنن میں دو جگہ اپنا یہ فیصلہ لکھا ہے کہ اس واقعہ میں اصح بات یہی ہے کہ رکانہ نے لفظ بتہ سے طلاق دی دیکھو ص ۲۱۸ و ص ۲۱۹ (اعلام ص ۱۹ و ۲۰)

صاحب آثار لکھتے ہیں:

''مولف نے حسب دستور قطع و برید[1] سے کام لیا ہے ابوداؤد کی پوری عبارت یہ ہے قال ابوداؤد هذا اصح من حديث ابن جريج ان ركانة طلق امرأته ثلاثاً لانهم اهل بيته وهم اعلم به وحديث ابن جريج رواه عن بعض بني ابي رافع عن عكرمة عن ابن عباس .... غور فرمائیں کہ ابوداؤد کی اس عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ ابن جریج کی روایت میں رکانہ کا قصہ مذکور ہے...... حالانکہ یہ بالکل غلط ہے بلکہ ابن جریج کی روایت میں رکانہ کے باپ عبد یزید کا

---

(۱) ناظرین اعلام ص ۱۹ و ۲۰ میں میری منقولہ بالا عبارت پڑھیں، میں نے ابوداؤد کی عبارت نقل نہیں کی، بلکہ ان کی عبارت کا اتنا مفہوم کہ رکانہ کا لفظ بتہ سے طلاق دینا اصح ہے، اپنے الفاظ میں لکھا ہے اور اس کے لیے ابوداؤد ص ۱۱۸ و ۱۱۹ کا حوالہ دیدیا ہے اب ناظرین انصاف کریں کہ میں نے کیا قطع و برید کی، اگر قطع و برید سے عبارت کا کچھ حصہ نقل کرنا کچھ چھوڑ دینا مراد ہے تو میں نے یہ نہیں کیا اور اگر اس سے یہ مراد ہے کہ اپنے مطلب کا مفہوم لے لیا اور اپنے خلاف جو تھا اس کو چھوڑ دیا تو میں نے یہ بھی نہیں کیا اس لیے کہ ابوداؤد کے کلام میں کوئی بات میرے خلاف نہیں ہے، بہر حال قطع و برید کا الزام جھوٹا اور سراسر فریب ہے۔

اب مجیب کی ایک عیاری ملاحظہ ہو کہ وہ میری اس بات کو جو اعلام ص ۱۹ و ۲۰ میں ہے اور اس بات کو جو ص ۸ سطر ۱۳ و ۱۴ میں ہے دونوں کو ایک قرار دے کر وہاں جو عبارت ابوداؤد کی میں نے نقل کی ہے اس کو وہ یہاں نقل کرتے ہیں، کوئی عقل وخرد کے اس مجسمہ سے پوچھے کہ ص ۸ میں هذا اصح من حديث ابن جريج جو عبارت ہے کیا اس کا یہی ترجمہ ہے کہ ''بات یہی ہے کہ رکانہ نے اپنی بی بی کو لفظ بتہ سے طلاق دی'' اس کے جواب میں ''ہاں'' تو کوئی طفل دبستاں بھی نہیں کہہ سکتا، پس جب ص ۸ والی عبارت کا یہ ترجمہ نہیں ہوسکتا تو اس کا ذکر یہاں پر ابلہ فریبی و مغالطہ بازی ہے یا نہیں، مجیب صاحب کے ہواخواہ دیکھیں کہ کیسی چالاکی سے مبحث کو چھوڑ کر ایک ایسی عبارت کو مجیب نے مبحث قرار دیا ہے جس میں اپنے ہنر کی نمائش کا کچھ موقع مل سکے اور جو عبارت بالکل صریح تھی لیکن اس میں کوئی کارروائی ممکن نہ تھی اس کو ایک دم کھا گئے۔

قصہ مذکور ہے .... ثانیاً ابوداؤد کے کلام میں اس سے بھی زبردست ایک اور غلطی ہے ....
فرماتے ہیں نافع اور عبداللہ کی حدیثیں ابن جریج کی حدیث سے زیادہ صحیح اس وجہ سے ہیں کہ نافع اور علی رکانہ کے گھر والے ہیں ان کو جو واقعہ معلوم ہوگا وہ صحیح ہوگا۔ یہ وجہ تو اس وقت صحیح ہوسکتی ہے جب بیرونی اور اندرونی شہادتیں ایک ہی شخص کے متعلق ہوتیں اور باہم مختلف ہوتیں تو کہا جاتا کہ گھر کے لوگوں کی بات زیادہ قابل اعتبار سمجھی جانی چاہئے الی آخرہ (آثار مختصراً ص ۵۰ و ۵۱)

جواب:- ناظرین مجیب کی اس تہذیب وشائستگی کو ملاحظہ فرمائیں کہ وہ ابوداؤد کے ساتھ کس ادب سے پیش آئے ہیں اور سب کچھ لکھ جانے کے بعد جب ان کو خیال آیا ہے کہ میری اس حرکت سے میرے ہواخواہ بھی ناراض ہوجائیں گے تو اخیر میں یہ لکھ دیا ہے کہ ابوداؤد کی عبارت مسخ ہوگئی ہے یا کسی حاسد نے بڑھا دیا ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ساری باتیں مجیب کے فہم عالی اور اعلی قابلیت کی روشن دلیلیں ہیں۔ میرا دعوی ہے کہ جو عبارت اوپر نقل کی گئی ہے وہ لفظ بلفظ امام ابوداؤد کی ہے اور اس میں کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوا ہے،اس لیے کہ سنن ابوداؤد ان کتابوں میں سے ہے جو اپنے وجود کے وقت سے ہمیشہ مخدوم رہی ہیں،یعنی ہمیشہ ان کی روایت،ان کا درس ان کی شرح کا سلسلہ قائم رہا ہے اور ایسی کتابوں میں تحریف کی گنجائش نہیں ہوا کرتی اور اگر کوئی بے عقل تحریف کرتا بھی ہے تو اس کی خیانت فوراً پکڑ جاتی ہے۔

علاوہ بریں صرف اتنی بات سے کسی عبارت کا مسخ شدہ یا الحاقی ہونا ثابت نہیں ہوسکتا کہ وہ عبارت مجیب صاحب اور ان کے امثال کی سمجھ میں نہ آئے۔ اگر ایسا ہو تو کسی عبارت پر اطمینان باقی نہیں رہ سکتا۔ بیچارے مجیب صاحب نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ جو عبارتِ نزاعی ابوداؤد کے صرف ایک ہی نسخہ میں نہیں ہے بلکہ تمام مطبوعہ نسخوں میں چاہے وہ مصر کے چھپے ہوں یا ہندوستان کے مختلف مطابع کے ہوں موجود(۱) ہے۔اور بڑی بات یہ ہے کہ امام زیلعی، ابن تیمیہ، ابن القیم، حافظ عبدالحق (۲)، حافظ ابن حجر، منذری، اور شوکانی، ان سب محدثین کے نسخوں میں یہ عبارت موجود تھی، اس لیے کہ ان تمام حضرات نے ابوداؤد کی ترجیح وتصحیح کا ذکر کیا ہے اور بعض حضرات نے وہ عبارت بھی نقل کی ہے اور

---

(۱) بلکہ قلمی نسخوں میں بھی یوں ہی ہے میں نے ایک نسخہ ۱۲۲۴ھ کا لکھا ہوا حال ہی میں دیکھا ہے اس میں یہ عبارت بالکل یونہی ہے ۱۲ منہ۔

(۲) دیکھو ان کی کتاب الاحکام، جس کا قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری بانکی پور میں میں نے بچشم خود دیکھا ہے ۱۲ منہ

لطف یہ ہے کہ مخالفین کے سب سے زیادہ معتمد علیہ ابن تیمیہ اور ابن القیم نے اس عبارت کو نقل کیا ہے اور مسخ یا الحاق کا دعویٰ نہیں کیا ہے، بلکہ اس کو صحیح مانتے ہوئے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ اس گذارش کے بعد اب عبارت کی غلطی کی جو وجہ مجیب نے ذکر کی ہے اس کی سخافت ظاہر کرتا ہوں، مجیب صاحب کا ابوداؤد پر یہ اعتراض جڑنا کہ انھوں نے ابن جریج کی حدیث میں رکانہ کے قصہ کا مذکور ہونا بیان کیا ہے حالانکہ اس میں رکانہ کے باپ کا قصہ مذکور ہے''، ان کی کوتاہ نظری وسراسر نافہمی ہے، اس لیے کہ امام ابوداؤد نے ص ۱۱۸ میں بتہ کی ترجیح کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی ترجیح دی ہے کہ یہ واقعہ رکانہ کا ہے ان کے باپ کا نہیں ہے۔ ص ۱۱۸ میں ابن جریج کی حدیث لکھ کر فرماتے ہیں: **قال ابوداؤد: حديث نافع بن عجير و عبدالله بن علی بن يزيد بن ركانة عن أبيه عن جده أن ركانة طلق امرأته فردها إليه النبی ﷺ أصح لأنهم ولد الرجل وأهله أعلم به وأن ركانة انما طلق امرأته البتة فحملها النبی ﷺ واحدة** (یہ عبارت بالکل اسی طرح اعلام الموقعین ص میں منقول ہے) ناظرین ملاحظہ فرمائیں ابوداؤد نے اس عبارت میں دو باتیں ذکر کی ہیں ایک یہ کہ رکانہ کا طلاق دینا اصح ہے اور دوسری یہ کہ رکانہ نے لفظ بتہ سے طلاق دی۔ اور ظاہر ہے کہ ابن جریج کی حدیث کے بعد ابوداؤد کے اس لکھنے کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ ابن جریج کی حدیث میں کسی راوی نے رکانہ کی بجائے ان کے باپ کا نام لے لیا ہے اور بجائے بتہ کے ثلاثاً کہہ دیا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے صحیح یہ ہے کہ رکانہ نے طلاق دی اور لفظ بتہ کے ساتھ دی۔

جب ص ۱۱۸ میں ابوداؤد یہ ظاہر کر چکے تو ص ۱۱۹ میں ابن جریج کی حدیث میں بھی رکانہ ہی کا قصہ ہونا بیان کر دیا، اس لیے کہ ان کے نزدیک یہی ہونا چاہئے تھا اگرچہ غلطی و وہم سے کسی راوی نے رکانہ کے باپ کا نام لے لیا ہے۔ حاصل یہ کہ ابن جریج کے بیان کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنی تحقیق وتصحیح کے لحاظ سے انھوں نے رکانہ کا نام لیا ہے۔

علاوہ بریں اگر مان لیجئے کہ عبارت میں بجائے ابا رکانة کے صرف رکانة لکھ گیا ہے تو اس سے ابوداؤد کے فیصلہ پر کیا اثر پڑا۔ فیصلہ تو بہرحال ابوداؤد کا یہی ہے کہ ابن جریج کی حدیث سے نافع وعبداللہ کی حدیث اصح ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ ایسی جاہلانہ بات لکھتے ہوئے لوگوں کو شرم بھی نہیں آتی۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں نے ابوداؤد کے دو مقامات کا حوالہ دیا ہے مجیب نے

صرف ایک جگہ کی عبارت لے کر شور وغل مچانا شروع کر دیا اور یہ نہیں دیکھا کہ دوسری جگہ کی عبارت میں ان کی ان کارروائیوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور وہ ص ۱۱۸ کی عبارت ہے جو ابھی میں نے نقل کی ہے، پس اگر بالفرض ص ۱۱۹ کی عبارت میں کچھ غلطی بھی ہو تو ص ۱۱۸ میں تو کوئی غلطی نہیں ہے، اس کا آپ کے پاس کیا جواب ہے اور اس کو دیکھتے ہوئے آپ نے پورے دو صفحے بیکار کیوں سیاہ کیے؟(۱)

اب رہا مجیب کا ابوداؤد کی بیان کی ہوئی وجہ پر کلام کرنا، تو مجیب کا یہ کلام اس بات پر مبنی ہے کہ ''ابن جریج کی حدیث میں عبد یزید کا واقعہ ہے اور نافع وغیرہ کی حدیث مین رکانہ کا اور دونوں واقعے بالکل الگ الگ ہیں اور دو شخصوں کے متعلق ہیں'' جیسا کہ مجیب نے خود ان باتوں کی تصریح کی ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ ساری باتیں غلط ہیں اور مجیب صاحب کی اعلیٰ قابلیت کی مرہون منت ہیں۔

اولاً: – اس لیے کہ ابوداؤد جیسے امام حدیث نے دونوں حدیثوں میں ایک ہی واقعہ کا بیان مانا ہے اور اس کے خلاف مجیب نے کسی ایک محدث کا کلام بھی نقل نہیں کیا ہے۔

ثانیاً: – علامہ حافظ ذہبی نے تلخیص میں ابن جریج کی حدیث کو غلط کہا ہے اور فرمایا ہے کہ عبد یزید نے اسلام کا زمانہ ہی نہیں پایا۔

ثالثاً: – ذہبی ہی نے تجرید میں عبد یزید کے واقعہ کی نسبت لکھا ہے: **لا یصح والمعروف أن صاحب القصة رکانة.** عبد یزید کا قصہ صحیح نہیں ہے اور معروف یہ ہے کہ صاحب واقعہ طلاق رکانہ ہیں۔

رابعاً: – بالکل مجیب کی زبان میں عرض ہے کہ جو بات اس حدیث کے (جس میں عبد یزید کا طلاق دینا مذکور ہے) جھوٹ اور باطل ہونے پر دلالت کرتی ہے یہ ہے کہ کسی صحیح یا ضعیف، متصل یا منقطع روایت سے معلوم نہیں ہوتا کہ عبد یزید نے اسلام کو پایا ہو، پس یہ بلا شک محال ہے یعنی یہ حدیث یقیناً موضوع ہے، (دیکھو آثار ص ۱۰۵ و ۱۰۶ ہادنی تصرف)

اب سنئے کہ میری پہلی وجہ کا حاصل یہ ہے کہ جب ابوداؤد کی تحقیق میں دونوں حدیثیں ایک ہی واقعہ سے متعلق ہیں تو اس صورت میں خود مجیب کے نقطۂ نظر سے بھی ابوداؤد کی وجہ بالکل درست

---

(۱) مجیب صاحب نے اپنی اس دیانت وایمانداری کو برابر نباہا ہے اور کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا ہے کہ مولف نے دو مقام کا حوالہ دیا ہے اور مجیب صرف ایک ہی مقام کا جواب دیتا ہے اور لوگوں کو مغالطہ میں ڈالتا ہے کہ گویا دونوں جگہ مجیب کی مزعومہ غلطی ہے چنانچہ ص ۵۶ میں ابوداؤد کے کلام کو غلط کہنا اسی دیانت کا اثر ہے ۱۲ منہ

ہے۔ اور میری دوسری، تیسری اور چوتھی وجہ کا حاصل یہ ہے کہ اگر عبد یزید کو صاحبِ واقعہ کہا جائے تو ابن جریج کی حدیث خود بقول مجیب جھوٹی اور باطل ہوجائے گی، لہٰذا اگر مجیب صاحب اس کی کچھ اہمیت ثابت کرنا چاہتے ہیں تو اتنا کہنا گوارا فرمائیں کہ اس میں کسی راوی سے وہم ہوگیا ہے اور اس نے بجائے بیٹے کو باپ کا نام لکھ دیا ہے، اور اگر مجیب یہ کہہ دیں گے تو یہ ثابت ہوجائے گا کہ نافع وغیرہ اور ابن جریج دونوں کی حدیثوں میں ایک ہی واقعہ مذکور ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مجیب نے ابوداؤد کی عبارت قطعاً نہیں سمجھی، اگر وہ غور کرتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ ابوداؤد نے پہلے اندرونی شہادت سے صاحبِ واقعہ کی تعیین کی ہے۔ اور جب صاحبِ واقعہ متعین ہوگیا تو اس کے بعد اندرونی ہی شہادت سے صورتِ واقعہ کی تعیین کی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اتنا تو سب کو مسلّم ہے کہ رکانہ کے خاندان میں طلاق کا ایک واقعہ پیش آیا ہے۔ لیکن اس بات کی تعیین میں اختلاف ہے کہ اس خاندان میں رکانہ نے طلاق دی یا ان کے باپ نے، نیز طلاق دینے والے نے تین طلاقیں دیں یا لفظ بتہ کے ساتھ، بیرونی شہادت ظاہر کرتی ہے کہ باپ نے طلاق دی اور تین دی، اور اندرونی شہادت یہ ثابت کرتی ہے کہ رکانہ نے طلاق دی اور لفظ بتہ کے ساتھ دی۔ پس امام ابوداؤد نے فیصلہ کیا کہ اندرونی شہادت زیادہ قابل اعتبار ہے اس لیے یہ واقعہ رکانہ کا ہے۔

ابوداؤد کے اس فیصلہ کی حقانیت اس بات سے بھی واضح ہوتی ہے کہ اس باب میں ایک دوسری بیرونی شہادت بھی اندرونی شہادت کی موید ہے، برخلاف بیرونی شہادت کے کہ اس کی موید کوئی دوسری شہادت نہیں ہے، اور خود تنہا ہی وہ حد درجہ کمزور شہادت ہے، اس کے علاوہ تاریخی وعقلی معیار پر بھی وہ پوری نہیں اترتی، اور جب اس کی تعیین ہوگئی کہ صاحب واقعہ رکانہ ہیں تو صورت طلاق کی تعیین کے باب میں ابوداؤد کی وجہ کو صحیح تسلیم کرنے سے مجیب کسی طرح انکار ہی نہیں کرسکتے، اس لیے کہ وہ اس کو مان چکے ہیں۔ اب مجیب صاحب بتائیں کہ انھوں نے ابوداؤد کے جواب میں جو بات کہی ہے ''اس کو کوئی پاگل بھی نہیں کہہ سکتا'' یا ابوداؤد کی بات کو؟

(جاری ہے)

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عدالت وراستی کے دلائل کتاب وسنت سے

تحریر: دکتور محمد بن عبداللہ الوھیبی (تیسری قسط) ترجمہ: مولانا ازہر رشید الاعظمی

سبِّ صحابہ رضی اللہ عنہم اوراس کے احکام

سبِّ صحابہ کی مختلف قسمیں ہیں، اور ہر قسم کا ایک خاص حکم ہے:

سبّ کی تعریف: سبّ کے معنی ایسے کلام کے ہیں جس سے کسی کی تنقیص اور توہین مقصود ہو، اور وہ ہر ایسی چیز ہوسکتی ہے جو لوگوں کے مختلف عقائد کے باوجود انسانی عقل کے نزدیک سبّ (بدگوئی وبدزبانی) کے مفہوم میں شمار ہوتی ہو، مثلاً لعن وتقبیح جیسے الفاظ کا استعمال(۱)۔

لعن کے معنی ہیں لعنت ملامت کرنا یعنی برا بھلا کہنا، اور تقبیح کے معنی ہیں کسی کی مذمت کرنا اوراس کی برائی ظاہر کرنا۔

سبِّ صحابہ یعنی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں بدزبانی اور بدگوئی کے مختلف درجے ہیں، جن میں بعض درجے دیگر درجوں سے زیادہ سنگین ہیں؛ جیسے کفر یا فسق کی تہمت، یا دنیوی امور مثلاً بخل یا رائے کی کمزوری کا الزام۔ پھر یہ لعن طعن یا تو تمام صحابہ کو کی گئی ہوگی، یا ان کی اکثریت کو، یا بعض صحابۂ کرام کو یا ان میں سے کسی فرد خاص کو۔ پھر وہ فرد خاص یا تو ان صحابہ میں سے ہوگا، جن کی فضیلت متواتر دلیلوں سے ثابت ہے، یا ایسا صحابی ہوگا جس کی فضیلت اس طرح کے دلائل سے ثابت نہیں۔

ان تمام قسموں کے احکام کا تفصیلی بیان حسب ذیل ہے:

پہلی قسم: تمام یا اکثر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو -نعوذ باللہ- کافر ومرتد یا فاسق ٹھہرانا۔

جس شخص نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ایسی بات کہی، اس کے کفر میں کسی شک کی گنجائش نہیں، اس کی مختلف وجوہات کا ذکر ہم ذیل میں کرتے ہیں:

(۱) الصارم المسلول: ۵۶۱

۱:- اس تہمت کا صاف مطلب یہ ہوا کہ حاملین قرآن وحدیث سب کے سب کافر یا فاسق تھے، اس کی وجہ سے قرآن وحدیث بھی مشکوک ہو جائیں گے؛ اس لیے کہ ناقلین کو مطعون ومجروح کرنے سے خود قرآن وحدیث کا مطعون ومجروح ہونا لازم آئے گا۔

۲:- اس قول سے قرآن کریم کی اس نص صریح کا انکار لازم آتا ہے کہ اللہ تعالی صحابۂ کرام سے راضی ہے اور اس نے ان کی تعریف کی ہے، چنانچہ ان کی فضیلت کو ثابت کرنے والی قرآن وحدیث کی نصوص سے حاصل ہونے والا علم قطعی اور یقینی ہے[۱]، اور قطعی اور یقینی باتوں کا انکار کرنے والا کافر ہوتا ہے۔

۳:- اس قول سے رسول اللہ ﷺ کی ایذا رسانی ہوتی ہے، کیونکہ صحابہؓ آپ ﷺ کے ساتھی اور خاص لوگ ہیں، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی شخص کو یا اس کے خاص لوگوں کو برا بھلا کہنا اور ان پر طعن وتشنیع خود اس شخص کی ایذا رسانی کا باعث ہوتی ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کی ایذا رسانی کا کفر ہونا تو ایک طے شدہ اور مسلمہ حقیقت ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ قسم کا حکم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اور جو شخص اس سے آگے بڑھ کر یہ دعوی کرنے لگے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد صحابۂ کرام ﷺ میں چند افراد کے علاوہ -جن کی تعداد دس سے کچھ اوپر تھی- سب کے سب مرتد ہو گئے تھے، یا عام صحابۂ کرام ﷺ فاسق ہو گئے تھے، تو ایسے شخص کے کفر میں بھی کوئی شک نہیں؛ کیونکہ وہ اس رضا اور تعریف وتوصیف کی تکذیب کر رہا ہے جو انھیں اللہ کی طرف سے حاصل تھی، اور جس کی تصریح قرآن مجید نے مختلف مقامات میں کی ہے۔ بلکہ جو شخص اس طرح کے افراد کے کفر میں شک کرے تو خود اس کا کافر ہونا متعین ہوتا ہے۔'' آگے مزید فرماتے ہیں: ''اور ایسے شخص کا کافر ہونا دین اسلام سے ضروری طور پر معلوم ہوتا ہے''[۲]۔

اور ابن حجر ہیتمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''پھر کلام -یعنی اختلاف- بعض صحابۂ کرام ﷺ کی طعن وتشنیع میں ہے، لیکن اگر تمام صحابۂ کرام ﷺ کی شان میں بدزبانی کی گئی تو اس کے کفر ہونے میں کوئی شک نہیں ہے''[۳]۔

سابقہ عمومی دلائل کی وضاحت کے ساتھ بعض علماء نے دیگر تفصیلی دلائل بھی ذکر کیے ہیں، جن میں سے بعض دلیلیں یہ ہیں:

---

(۱) الرد علی الرافضة:۱۹ (۲) الصارم المسلول:۵۸۶-۵۸۷

(۳) الصواعق المحرقة:۳۷۹

۱:- پہلی دلیل علماء کرام کی وہ تفسیر ہے جو انھوں نے سورۂ فتح کی آخری آیت ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ﴾ تا ﴿لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ میں کی ہے۔ اس آیت سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ان لوگوں کے کفر پر استدلال کیا ہے جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے نفرت اور دشمنی رکھتے ہیں، کیونکہ صحابۂ کرامؓ پر ان کو غصہ آتا ہے، اور صحابہ پر جس کو غصہ آئے، وہ یقیناً کافر ہوگا۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اس استنباط سے اتفاق کیا ہے[1]۔

۲:- دوسری دلیل امام بخاری و مسلم رحمۃ اللہ علیہما کی روایت کردہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "**آيةُ الإيمانِ حُبُّ الأنصارِ، وآيةُ النِّفَاقِ بُغْضُ الأنصارِ**" 'انصار کی محبت ایمان کی علامت ہے، اور انصار سے بغض و عداوت نفاق کی پہچان ہے'۔ اور ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: "**لا يُحِبُّهم إلا مُؤمِنٌ، ولا يُبْغِضُهم إلا مُنَافِقٌ**" 'انصار سے صرف مومن کو ہی محبت ہوتی ہے، اور ان سے بغض و عداوت صرف منافق ہی رکھ سکتا ہے'۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**لا يُبْغِضُ الأنصارَ رَجلٌ آمَنَ باللهِ واليَومِ الآخِرِ**"[2] 'انصار سے وہ شخص نفرت نہیں کرے گا جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو'۔ اور جس نے ان کو برا بھلا کہا وہ ان کی نفرت و دشمنی سے بھی آگے بڑھ گیا، پس لامحالہ وہ ایسا منافق ہوگا جس کا اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں[3]۔

۳:- تیسری دلیل وہ واقعہ ہے جو امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے، کہ آپ نے اس شخص کو کوڑے لگائے جس نے ان کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر فضیلت دی تھی، پھر آپ نے فرمایا تھا کہ: 'حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد فلاں فلاں چیزوں میں تمام لوگوں سے بہتر تھے'، پھر آپ نے مزید فرمایا: 'جو شخص اس کے سوا کوئی بات کہے گا تو ہم اس پر وہ حد جاری کریں گے جو تہمت لگانے والے پر کرتے ہیں'[4]۔

یہی بات امیر المؤمنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بھی کہی تھی کہ: "جو مجھے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر فضیلت دے گا تو میں اس پر حد قذف جاری کروں گا"[5]۔

(۱) الصواعق المحرقة: ۳۱۷، تفسير ابن كثير: ۲۰۴/۴۔ یہ روایت امام خلال کی کتاب السنۃ صفحہ ۴۷۸ میں سند کے ساتھ مذکور ہے۔ (۲) صحیح مسلم: ۸۶/۱ (۳) الصارم المسلول: ۵۸۱

(۴) فضائل الصحابة للإمام أحمد: ۳۰۰/۱، الصارم المسلول: ۵۸۵

(۵) فضائل الصحابة: ۸۳/۱ والسنة لابن أبي عاصم: ۵۷۵/۲

تو جب دونوں خلیفۂ راشد حضرت عمر وعلی رضی اللہ عنہما اس شخص پر حد قذف جاری کرتے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما سے، یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے افضل قرار دیتا ہے- جبکہ صرف کسی کو کسی سے افضل قرار دینا نہ بدگوئی میں شامل ہے نہ عیب جوئی میں- تو معلوم ہوا کہ حضرت عمر وعلی رضی اللہ عنہما کے نزدیک صحابۂ کرام کی شان میں زبان درازی کرنے والے کی سزا افترا پردازی کی سزا سے بہت زیادہ بڑھ کر تھی[1]۔

دوسری قسم: کسی صحابی کی شان میں ایسی بیہودہ گوئی جو اس کے دین کو مجروح کرتی ہو:

جیسے کسی ایسے صحابی پر کفر یا فسق کی تہمت لگائی جائے جس کے فضائل خبر متواتر سے ثابت ہوں[2]، مثلاً خلفاء راشدین۔

سبِّ صحابہ کی یہ قسم صحیح قول کے مطابق کفر ہے، کیونکہ یہ خبر متواتر کے ذریعہ ثابت شدہ امر کی تکذیب ہے۔

ابو محمد بن ابی زید، سحنون سے نقل کرتے ہیں کہ: 'جو شخص حضرات ابو بکر وعمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہ کہے کہ یہ تمام لوگ ضلالت وگمراہی اور کفر پر تھے، تو اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ اور جو شخص یہی بات ان حضرات کے علاوہ دیگر صحابۂ کرامؓ کے بارے میں کہے تو اسے قتل تو نہیں کیا جائے گا، لیکن اس کو سخت ترین اور عبرت ناک سزا ضرور دی جائے گی[3]۔

اور ہشام بن عمار کہتے ہیں کہ: 'میں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: جو ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما کی شان میں گالی بکے اور انھیں سب وشتم کا نشانہ بنائے، اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اور جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو گالی دے اور ان کی شان میں گستاخی کرے تو اسے بھی قتل کر دیا جائے گا، اس لیے کہ حق تعالیٰ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں: ﴿يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾[4] (ترجمہ: اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ پھر اس قسم کی

---

(۱) الصارم المسلول: ۵۸۶

(۲) بعض علماء اس قسم کو خلفاء راشدین کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں، اور بعض اس کو صرف حضرت ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما تک محدود رکھتے ہیں۔ اور تیسری رائے علماء کی یہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان ان کے فضائل کے دلائل اور نصوص کے تواتر اور عدم تواتر کے اعتبار سے فرق کیا جائے گا، اور یہی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے واللہ اعلم۔ اور اسی طرح خلفاء راشدین پر سبّ وشتم کرنے والوں کو کافر کہنے والے علماء میں کچھ تو ایسے ہیں جو صرف کفر کی تہمت لگانے والوں پر یہ حکم صادر کرتے ہیں، جبکہ دوسرے علماء ہر اس بدگوئی کے لیے عام مانتے ہیں جس سے ان حضرات کا دین مطعون ہوتا ہو۔

(۳) الشفا للقاضي عياض: ۱۱۰۹/۲ تحقيق: البجاوي (۴) سورة النور: ۱۷

حرکت کبھی نہ کرنا اگر تم ایمان والے ہو) تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس نے آپ پر تہمت لگائی اس نے قرآن کے اس حکم کی خلاف ورزی کی، اور جو قرآن کی خلاف ورزی کرے وہ واجب القتل ہے(۱)۔

لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا دوسری روایت کے مطابق ایک اور قول یہ ہے کہ: 'جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو گالی دے اسے کوڑے لگائے جائیں، اور جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو گالی دے اسے قتل کر دیا جائے۔ آپ سے دریافت کیا گیا: یہ فرق کیوں؟ تو آپ نے جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ: جس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی اس نے قرآن کے حکم کی مخالفت کی'۔

بظاہر- واللہ اعلم- امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول سے آپ کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے، کہ یہاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طعن وتشنیع سے تکفیر سے کم درجے کی طعن وتشنیع مراد ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اس مقصد کی وضاحت خود آپ کے کلام کے اس بقیہ حصے سے ہوتی ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے متعلق ہے، جس میں آپ نے فرمایا: "من رماها فقد خالف القرآن" . 'جس نے آپ پر تہمت لگائی اس نے قرآن کی خلاف ورزی کی'۔ معلوم ہوا کہ یہ ایک مخصوص قسم کی گالی اور عیب جوئی ہے جس کا ارتکاب کرنے والا کافر ہو جاتا ہے۔ اور یہ حکم ہر قسم کی گالی اور عیب جوئی کو شامل نہیں ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی یہ توجیہ اس لیے ضروری ہے کہ خود امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول منقول ہے کہ جو شخص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کم درجے کے صحابی کی تکفیر کرے، اسے بھی قتل کر دیا جائے گا(۲)۔

ابن حجر مکی نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر دشنام طرازی کے حکم سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے جس بات کی جانب اشارہ کیا ہے وہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی اس توجیہ سے قریب ہے، کہتے ہیں: اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دشنام طرازی احناف کے نزدیک کفر ہے، اور شوافع کے یہاں بھی دو روایتوں میں سے ایک کے مطابق کفر ہے، اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ اس سے کوڑوں کی سزا واجب ہوگی، -یعنی آپ پر دشنام طرازی کفر نہیں ہے- ہاں البتہ خوارج کے سلسلے میں اس حکم سے استثناء ہوگا، کیونکہ خوارج کی دشنام طرازی ان کے نزدیک بھی کفر ہے۔ تو اب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مسئلہ کے دو رخ ہیں: اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو برا کہا اور تکفیر نہیں کی تو آپ اس کو کفر نہیں سمجھتے، اور اگر تکفیر کے ساتھ طعن وتشنیع کی ہے، تو ایسے شخص کو آپ بھی کافر سمجھتے ہیں(۳)۔

---

(۱) الصواعق المحرقة: ۳۸۴ (۲) الشفا: ۱۱۰۹/۲ (۳) الصواعق: ۳۸٦

نیز ابن حجر نے یہ بھی لکھا ہے کہ: ''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان جیسے وہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جن کے حق میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی خبر دی ہے، ان کی تکفیر کے بارے میں شوافع نے کچھ نہیں کہا، میرا خیال ان کی تکفیر کرنے والوں کے قطعی کافر ہونے کا ہے''(۱)۔

اور خرشی نے لکھا ہے: ''وہ شخص کافر ہو جائے گا جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر وہ تہمت لگائے جس سے اللہ نے ان کی براءت اور بے گناہی ظاہر فرمادی ہے، یا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صحابیت، یا عشرہ مبشرہ کے اسلام، یا تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اسلام کا انکار کرے، یا خلفاء راشدین کی یا ان میں سے کسی ایک کی تکفیر کرے''(۲)۔

بغدادی فرماتے ہیں: ''علماء کرام ان تمام لوگوں کی تکفیر کے قائل ہیں جو ان دس صحابۂ کرامؓ میں سے کسی ایک کی بھی تکفیر کرتا ہے جن کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی خبر دی ہے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام ازواج مطہرات سے محبت کے قائل ہیں، اور ان لوگوں کی تکفیر کے بھی قائل ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام بیویوں یا ان میں سے بعض کی تکفیر کریں''(۳)۔

زیر نظر مسئلہ میں مشہور اختلاف پایا جاتا ہے، جس میں راجح شاید وہی قول ہے جو پیچھے گزر چکا ہے۔

اور جو حضرات ایسے شخص کے -جس کی یہ کیفیت ہو- عدم کفر کے قائل ہیں، وہ بھی اس کے فاسق و گناہ گار ہونے پر متفق ہیں، کیونکہ اس نے کبیرہ گناہوں میں سے ایک بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے، جس کی وجہ سے وہ صحابی کے مقام و مرتبہ کے لحاظ سے اور اپنی بدگوئی کی نوعیت کے اعتبار سے تعزیری و تادیبی سزا کا مستحق ہے۔

اور اب اس کی تفصیل دیکھیے:

ابن حجر مکی لکھتے ہیں: 'صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عیب جوئی کرنے والوں کو جو علماء کرام کافر نہیں کہتے، وہ بھی ان کو فاسق و فاجر اور گناہ گار مانتے ہیں'(۴)۔

اور ابن تیمیہ نے لکھا ہے: 'ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ: یہ بات کہی جاتی تھی کہ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی دشنام طرازی گناہ کبیرہ ہے۔ اور یہی بات ابواسحاق سبیعی نے بھی کہی کہ: حضرت ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما کی دشنام طرازی ان کبیرہ گناہوں میں سے ہے جن کے بارے میں اللہ تعالی کا

---

(۱) الصواعق: ۳۸۵ (۲) الخرشي علی مختصر خلیل: ۷/۴۸

(۳) الفرق بین الفرق: ۳۶۰، تعلیق: محمد محی الدین عبدالحمید

(۴) الصواعق المحرقة: ۳۸۳

ارشاد ہے: ﴿إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ﴾(۱) (ترجمہ: اگرتم ان بڑے کاموں سے جوتمھیں منع کیے گئے ہیں بچتے رہے)۔

اور جب ان کی دشنام طرازی گناہ کبیرہ کے درجے میں ہے، تو اس کی کم سے کم سزا تعزیری ہونی چاہئے، کیونکہ شریعت میں تعزیری سزا کی مشروعیت ہر اس معصیت پر ہے جس پر حد شرعی اور کفارہ کا ثبوت نہیں۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں ہمیں صحابۂ کرام، تابعین، اور دوسرے اہل سنت والجماعت کے علماء وفقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نظر نہیں آتا، چنانچہ تمام علماء وفقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تعریف، ان کے لیے استغفار اور ان کے حق میں رحمت کی دعا کرنا ضروری ہے، اور اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بدگوئی کرنے والوں کو سزا دی جائے(۲)۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں: ''کسی صحابی کو گالی دینا کبیرہ گناہوں میں سے ہے، اور ہمارا اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ ایسے شخص کو تعزیری سزا دی جائے گی، قتل نہیں کیا جائے گا''(۳)۔

اور عبدالملک بن حبیب کہتے ہیں: ''جو شیعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغض ونفرت اور دشمنی کی حد تک پہنچ جائے اور ان پر تبرا کرنے لگے، تو اسے سخت تادیبی سزا دی جائے گی۔ اور اگر وہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے بھی نفرت ودشمنی کرنے لگے تو اسے اور زیادہ سخت سزا دی جائے گی، اور بار بار دی جائے گی، اور موت تک اسے قید کر دیا جائے گا''(۴)۔

مختصر یہ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عیب جوئی کی صورت میں صرف اس پر تازیانہ لگانے پر اکتفا نہیں کیا جائے گا جس پر آپ کے علاوہ کسی اور کی عیب جوئی کے سلسلے میں کیا جاتا ہے؛ کیونکہ وہ تازیانہ تو محض حقِ صحابیت کی پامالی کی وجہ سے ہے، لیکن جب صحابیت کے علاوہ ایسی چیزیں بھی آپ کے ساتھ شامل ہو گئیں جو مزید عزت واحترام کی متقاضی ہیں، جیسے اسلام اور جماعتِ مسلمین کی نصرت ومدد، اور آپ کے ہاتھوں حاصل ہونے والی مختلف فتوحات، اور آپ کو ملنے والی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت وغیرہ؛ تو یہ وہ اہم امور ہیں جن میں سے ہر ایک مزید ایسے حق کا متقاضی ہے جس کی پامالی کی جسارت مزید سزا کی موجب بنتی ہے(۵)۔

---

(۱) سورة النساء: ۳۱ — (۲) اللالكائي: ۱۲۶۲/۸، ۱۲۶۶، الصارم المسلول: ۵۷۸

(۳) مسلم بشرح النووي: ۹۳/۱۶ — (۴) الشفا: ۱۱۰۸/۲، والصارم المسلول: ۵۶۹

(۵) الصواعق المحرقة: ۳۸۷

اوپر جس تعزیری سزا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس کے نفاذ یا عدم نفاذ کے سلسلے میں حاکم وقت کو اختیار حاصل نہیں ہے، بلکہ اسے اس سزا کو نافذ کرنا ضروری ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''کسی شخص کے لئے یہ بات روا نہیں کہ وہ صحابۂ کرام ﷡ کی خامیوں کا ذکر کرے، یا ان کے کسی عیب یا نقص کی بنا پر انھیں طعن و تشنیع کا نشانہ بنائے۔ جو شخص اس جرم کا ارتکاب کرے اس کو سزا دینا اور اس کے خلاف تادیبی کارروائی کرنا حاکم وقت کی ذمہ داری ہے؛ اور اسے ایسے شخص کو معاف کرنے کا اختیار نہیں ہے، بلکہ حاکم وقت کا کام یہ ہے کہ اس کو سزا دے، اور اس سے توبہ کرائے؛ اگر وہ توبہ کرلے تو اس کی توبہ قبول کرلی جائے گی، اور اگر اپنے فعل پر اڑا رہے تو پھر سزا دی جائے گی اور قیدخانے میں ڈال دیا جائے گا تا آنکہ وہ باز آجائے یا اس کی موت واقع ہوجائے''(۱)۔

برادران اسلام کو اہل سنت کے امام حضرت احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول پر غور کرنا چاہئے جو انھوں نے کسی صحابی کی عیب جوئی اور طعنہ زنی کرنے والے کی سزا اور تادیبی کارروائی کے واجب وضروری ہونے کے سلسلے میں فرمایا ہے۔ اور جب بعض علماء کے نزدیک صحابۂ کرام ﷡ کو برا بھلا کہنا گناہ کبیرہ میں سے ہے، تو اس کو حلال وجائز سمجھنے والے کا حکم بھی وہی ہوگا جو گناہ کبیرہ کو حلال سمجھنے والے کا ہے۔

امام محمد بن عبدالوہاب صحابۂ کرام ﷡ کی طعن و تشنیع کو حلال سمجھنے والوں کا حکم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: 'جو شخص کسی خاص صحابی کو برا بھلا کہے اور یہ سمجھے کہ وہ اس کا مستحق ہے، یا اس کی بدگوئی جائز ہے؛ اور وہ خاص صحابی ان صحابۂ کرام ﷡ میں سے ہو جن کا فضل وکمال متواتر دلیلوں سے ثابت ہے، جیسے خلفاء راشدین، تو وہ شخص کافر ہوجائے گا؛ ان قطعی اور یقینی دلیلوں کو جھٹلانے کی وجہ سے جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں، اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ آپ ﷺ کو جھٹلانے والا کافر ہے؛ اور اگر اس پر طعن و تشنیع اس اعتقاد کے ساتھ نہیں کی کہ وہ اس کا مستحق ہے، یا اس کی بدگوئی جائز ہے، تو وہ کافر نہیں بلکہ فاسق ہوگا؛ اس لیے کہ مسلمان کی بدگوئی فسق وگناہ ہے۔ جبکہ بعض علماء نے شیخین یعنی ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو برا بھلا کہنے والوں پر مطلقاً کفر کا حکم لگایا ہے، واللہ اعلم'(۲)۔

قاضی ابویعلی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے اس جواب پر جو انھوں نے صحابۂ کرام ﷡ پر دشنام طرازی کرنے والوں کے حکم سے متعلق سوال پر دیا تھا- اور کہا تھا: **'ما أراه على الإسلام'** (میں اسے مسلمان نہیں سمجھتا)- تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے جواب **''ما أراه**

(۱) طبقات الحنابلة: ۲۴/۱، الصارم المسلول: ۵۶۸ (۲) الرد على الرافضة: ۱۹

علـى الإسلام" میں اس بات کا احتمال ہے کہ اسے اس صورت پر محمول کیا جائے جبکہ دشنام طرازی کرنے والے نے دشنام طرازی کو جائز وحلال سمجھا ہو، کیونکہ ایسے شخص کو کافر قرار دیے جانے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔اور سزائے قتل نافذ نہ کرنے کو اس صورت پر محمول کیا جائے گا جبکہ دشنام طرازی کرنے والے نے اس کو حرام سمجھتے ہوئے کیا ہو، حلال وجائز نہ سمجھا ہو، جیسے گناہوں کا ارتکاب کرنے والا۔اس کے بعد ابویعلی نے بقیہ احتمالات کا بھی ذکر کیا ہے"(۱)۔

گذشتہ معروضات کا -جو اس بدزبانی سے متعلق پیش کی جا چکی ہیں ،جس کے ذریعہ کسی ایسے صحابی کے دین وعدالت (راست روی) پرطعن وتشنیع کی گئی ہو جس کی فضیلت متواتر دلیلوں سے ثابت ہے- خلاصہ یہ ہے کہ ایسا شخص راجح قول کے مطابق کافر ہے،اس لیے کہ وہ ایک متواتر چیز کو جھٹلا رہا ہے۔اور جن علماء نے ایسے شخص کی تکفیر نہیں کی ان کا بھی اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب،اور تعزیری سزا اور تادیبی کارروائی کا مستحق ہے،اور اسے معاف کرنا حاکم کے لیے بھی جائز نہیں ہے؛اور ایسے شخص کی سزا میں صحابی کے مقام ومرتبہ کے لحاظ سے اضافہ ہوتا رہے گا،مگر ان سب کے باوجود ان علماء کے نزدیک اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی ،بجز اس صورت کے کہ وہ بدزبانی کو حلال وجائز سمجھے۔اور جو شخص حلال سمجھنے سے بھی آگے بڑھ کر سبّ وشتم ہی کو عبادت وبندگی اور قرب خداوندی کا ذریعہ سمجھے،تو پھر اس طرح کے لوگوں کے کفر میں کسی کا اختلاف نہیں،اور اس سلسلہ میں علماء کرام کی پیش کردہ تصریحات اور دلیلیں بالکل واضح ہیں۔

اللہ کی توفیق سے اس قسم کی مکمل وضاحت ہو جانے سے اس کے بعد آنے والی قسموں کی وضاحت بھی بڑی آسانی اور سہولت کے ساتھ ہو سکے گی،اسی لئے ہم نے اس قسم کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

تیسری قسم: جس صحابی کی فضیلت متواتر دلیلوں سے ثابت نہیں،اس کی ایسی بدگوئی جس کے ذریعہ اس کے دین کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا گیا ہو۔

پچھلے صفحات میں ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ جو شخص کسی ایسے صحابی کی شان میں جس کی فضیلت متواتر دلیلوں سے ثابت ہو دین سمجھ کر بدزبانی کرے،تو اسے راجح قول کے مطابق کافر قرار دیا جائے گا؛لیکن جس صحابی کی فضیلت تواتر کے ساتھ ثابت نہ ہو،تو ایسے صحابی کی شان میں بدزبانی

---

(۱)الصارم المسلول:۵۷۱

کرنے والے کو جمہور علماء کافر قرار نہیں دیتے، اس لیے کہ اس نے دین کی کسی بدیہی بات کا انکار نہیں کیا ہے؛ ہاں اگر وہ صحابی کی دشنام طرازی اس کی صحابیت کی وجہ سے کرے تو کافر ہو جائے گا۔

امام محمد بن عبدالوہاب لکھتے ہیں: ''اگر وہ صحابی ان صحابۂ کرام ﷺ میں سے ہو جن کے فضائل وکمالات تواتر کے ساتھ ثابت نہیں، تو ایسے صحابی کو برا بھلا کہنے والا بظاہر فاسق ہے؛ لیکن اگر وہ اس پر سب وشتم رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہونے کی وجہ سے کرے تو پھر اس کو کافر قرار دیا جائے گا''(۱)۔

چوتھی قسم: کسی صحابی کی ایسی عیب جوئی جس سے صحابی کے دین وعدالت پر آنچ نہ آتی ہو۔

بلاشبہ ایسا شخص تعزیری سزا اور تادیبی کارروائی کا مستحق قرار پائے گا، لیکن مذکورہ حوالہ جات کی کتابوں میں مختلف علماء کرام کے اقوال کے مطالعہ کے دوران میری نگاہ سے کوئی ایسا عالم نہیں گزرا جس نے اس قسم کی عیب جوئی کرنے والے کو کافر قرار دیا ہو، اور اس باب میں ان کے نزدیک کبار صحابہ اور صغار صحابہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے لکھا ہے: 'اگر کوئی شخص صحابۂ کرام ﷺ کی ایسی عیب گیری کرتا ہے جس سے ان کے دین وعدالت پر کوئی حرف نہیں آتا، جیسے کسی صحابی پر بخیلی وکنجوسی یا بزدلی یا قلت علم، یا پرہیزگاری کے فقدان جیسی چیزوں کا الزام لگاتا ہے تو ایسا شخص تادیبی وتعزیری کارروائیوں کا مستحق ہے، لیکن ہم صرف ان باتوں کی وجہ سے اس کے کفر کا حکم صادر نہیں کریں گے، اور اسی طرح کی عیب گیری پر ان علماء کے کلام کو محمول کیا جائے گا جو ان کی تکفیر کے قائل نہیں ہیں(۲)۔

اور ابو یعلی نے اس بدگوئی کی مثالوں کے ضمن میں صحابۂ کرام ﷺ پر امور سیاست سے واقفیت کی کمی کا الزام لگائے جانے کا بھی تذکرہ کیا ہے(۳)۔

اور اسی سے ملتے جلتے، رائے اور شخصیت کی کمزوری، غفلت ولاپروائی اور دنیا کی محبت جیسے وہ الزامات بھی ہیں جو صحابۂ کرام ﷺ پر لگائے جاتے ہیں۔

صحابۂ کرام ﷺ پر اس قسم کی طعنہ زنی سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں، اسی طرح عصر حاضر کے بعض اہل سنت کی تحقیقات میں بھی یہ چیزیں پائی جاتی ہیں، جو انھوں نے موضوعیت (عقلیت پسندی) اور علمی طریقۂ کار کے نام پر انجام دی ہیں، اور اس طرح کی بیشتر تحقیقات میں مستشرقین کا اثر نمایاں ہے۔

---

(۱) الرد علی الرافضة: ۱۹ (۲) الصارم المسلول: ۵۸۶ (۳) ایضاً: ۵۷۱

اعیان الحجاج سے ماخوذ

مشاہیر کرام کے واقعات حج

از: محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا حیدر فرنگی محلی ملا مبین فرنگی محلی کے صاحبزادہ تھے، جید عالم تھے، ۱۲۴۰ھ میں حج کو گئے تھے، تفصیل کے لیے نجاۃ المومنین ص ۱۸۰ ملاحظہ کیجئے، ۱۲۵۶ھ میں وفات ہوئی۔

مولانا محمد فصیح غازی پوری مشہور عالم اور سید احمد شہید سے بیعت تھے، آپ نے ۱۲۷۲ کے بعد حج کیا اسی سال مولانا رضا علی بنارسی [1] اور مولوی امانت اللہ فصیحی وغیرہما نے بھی حج کیا، مولانا فصیحی غازیپور سے بکسر تک بجرہ میں، بکسر سے رانی گنج تک پالکی پر، وہاں سے غالبًا ریل پر سفر کیا، اس لیے کہ اس وقت رانی گنج تک ریل ہو چکی تھی، کلکتہ سے پانی کے جہاز پر سفر کیا، طواف میں مولانا رضا علی ساتھ ہوتے تھے، مولوی محمد احسن لکھنوی مرید سید احمد شہید ہجرت کر کے مکہ میں مقیم تھے۔ شاہ غلام رسول کان پوری بھی موجود تھے۔

مولانا فصیح نے ۱۲۸۵ میں انتقال فرمایا۔

مولانا محمد احسن نانوتوی حضرت شاہ عبدالغنی کے مرید و خلیفہ تھے، احیاء العلوم و درمختار وغیرہ کے مترجم ہیں، محمد ایوب صاحب قادری نے ان کی سوانح عمری لکھی ہے، جو طبع ہو چکی ہے، آپ نے ۱۲۸۳ میں حج کی سعادت حاصل کی اور ۱۳۱۰ میں وفات ہوئی۔

مولوی ابوالبرکات ابن مولوی فضل امام بہاری انھوں نے حضرت شاہ عبدالغنی مجددی کی حیات میں دو حج کیے، برکات الدارین لحجاج الحرمین کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ـــــہ میں کلکتہ میں چھپی ہے، دوسری کتاب برکات الانس ۱۲۷۹ میں لکھی جو ۱۲۸۲ میں چھپی، یہ کتاب شاہ عبدالرشید مجددی کی زندگی میں لکھی گئی ہے، برکات الدارین کا ناتمام نسخہ میری نظر سے گذرا ہے۔

(۱) نزہۃ الخواطر میں ہے کہ مولانا رضا علی نے ۱۲۷۵ میں حج کیا، اور حضرت شاہ ابوسعید مجددی سے بیعت ہوئے، اور مولوی فرید کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا رضا علی نے ۱۲۹۲ میں بھی حج کیا تھا دیکھو ص ۲۶۸

حاجی قنبر علی رئیس بھٹولی ضلع لکھنؤ | ۱۲۸۷ھ میں حج سے مشرف ہوئے، اور ترغیب الغریب الی دیار الحبیب کے نام سے ایک رسالہ تصنیف کیا اس کا تاریخی نام آہنگ غریب ہے، اس رسالہ کا خلاصہ یہ ہے۔

روانگی از لکھنؤ	۶رشوال ۱۲۸۷ھ	کرایہ تا کان پور	۷رآنہ
روانگی از کانپور	۷رشوال ۱۲۸۷ھ	کرایہ تا الہ آباد	ایک روپیہ ۱۲ آنہ
روانگی از الہ آباد	۹رشوال ۱۲۸۷ھ	کرایہ الہ آباد سے جبل پور	تین روپیہ ۹ آنہ
روانگی از جبل پور	۱۰رشوال ۱۲۸۷ھ	کرایہ تا بمبئی	تیرہ روپے ۴ آنہ

۱۱ربجے دن کو بمبئی پہنچے، رباط حاجی اسماعیل سیٹھ میں قیام ہوا۔

بمبئی میں ۲۵ردن ٹھہرنا پڑا۔

کنگ آگبوٹ (کنگا آگبوٹ چھپا ہے) نامی جہاز سے سفر کیا، فرسٹ کلاس کا کرایہ ستر روپے اور تھرڈ کا سینتیس روپے تھا۔

۶رذی قعدہ کو جہاز میں سوار ہوئے، ۷ کو چلا، ۱۴رکو آدھی رات کے وقت جہاز طوفان میں پڑ گیا اور سب لوگ حیات سے مایوس ہو گئے، سویرا ہوتے ہوتے سکون ہوا۔ ۱۶رکو عدن پہنچے، یہاں انگریز کی حکومت ہے، ۱۷رکو عدن سے جہاز چلا، ۱۸رکو محاذی یلملم ہوا، ۲۱رکی دوپہر کو (۱۵ دن کے بعد) جدہ پہنچا، ۲۳رکو جدہ سے روانہ ہوئے، اونٹ اور خچر کے سوا کوئی سواری نہیں، شام کو چلے، رات بڑی تکلیف سے سواری ہی پر کاٹی، دن نکلنے پر حدہ پہنچے جو جدہ سے ۱۴رکوس ہے۔ وہاں سے شام کو چلے اور کچھ رات باقی تھی کہ حوالی مکہ میں پہنچ گئے قرش اڑھائی آنہ کا ہوتا ہے، بردہ وجواری کی بیع وشرا بکثرت ہوتی، ہندی خریدنے کی جرأت اس لیے نہیں کرتے کہ انگریز قانون میں منع ہے۔

علماء بہت ہیں، میری ملاقات زیادہ لوگوں سے نہیں ہوئی، مگر مولوی مرزا محمد امیر بیگ سے جو اعلم العلماء وافضل العلماء مولانا محمد اسحاق قدس سرہ کے خویش تھے، اور بڑے بزرگ وتبحر عالم تھے، اور اعیان مکہ میں سید حسن جمل اللیل شیخ المطوفین سے، اور حجاج میں حاجی واجد علی خاموش دربھنگوی سے جن کے بڑے بھائی امام علی خاں مستند عالم ہیں، دوسرے حج کے لیے مکہ میں ٹھہرے ہیں، ان کا لڑکا مولوی اسحٰق خاں بھی تبحر عالم ہے۔ شیخ محمد اشرف قنوجی اور مولوی نظام علی ساکن منڈیاؤں

نقشبندی مجددی سے بھی ملاقات ہوئی۔

منیٰ سے عرفات روانہ ہوئے تو درمیان میں ایک مقتول ملا جس کا روپیہ چھین کر مار ڈالا گیا تھا۔

مکہ سے مدینہ کا کرایہ شقدف کا ۲۷؍ ریال فرانسیسی (ایک ریال دو روپیہ ۴؍ آنہ انگریزی) اور شبری کا ۲۶ ریال۔ سلطانی ریال کا دو روپیہ ہوتا ہے۔

۲۹؍ ذی الحجہ کو مدینہ روانگی ہوئی منازل کے نام یہ ہیں، وادی فاطمہ، اسفان (عسفان) وادی فاطمہ سے ۲۲ کوس ہے، یکم محرم کو خلیص، ۲؍ محرم کو قضیمہ، ۴؍ کو رابغ (یہاں مولوی محمد محسن پنجابی کو حرامیوں نے لوٹ لیا کسی طرح جان بچی) مستورہ، ۵؍ محرم کو بیر شیخ (یہاں پیاس سے بُرا حال ہوا) بیر عبیداللہ، بیر عباس، وادی شہداء قریب بدر۔

واپسی میں بیر عباس سے صفراء بدر وغیرہ ہوتے ہوئے مستورہ پہنچے، سید محمد رضوان سے اعاظم فضلائے مدینہ سے ہیں، مصنف نے دلائل کی سند لی، کونیا آگبوٹ (شاید کوئن آگبوٹ) نامی جہاز سے واپسی ہوئی، ۱۳؍ صفر کو مکہ معظّمہ سے روانگی ہوئی، ۱۳؍ ربیع الاول کو لکھنؤ پہنچے۔

نواب عمر علی خاں رئیس باسودہ نواب صاحب نے ۱۸۷۷ء (تقریباً ۱۳۰۰ ہجری) کولمبیا نامی جہاز سے سفر حج کیا اور رسالہ ''زادِ غریب'' لکھا، اس رسالہ میں منازل مابین مکہ و مدینہ اس طرح بیان کی گئی ہیں۔

مکہ سے بعد جمعہ چلے، تنعیم پرانا عمرہ ۶۔ یا ۹ کوس پر ہے، آدھی رات کو وادی فاطمہ ۸؍ ساعت میں پہنچے، وہاں سے عسفان ۱۷؍ گھنٹے میں، وہاں سے قضیمہ ۴۰ ساعت میں، وہاں سے رابق (رابغ) ۱۳؍ گھنٹے، وہاں سے مسطورہ (مستورہ) گیارہ گھنٹے، وہاں سے بیر شیخ گیارہ گھنٹے، وہاں سے وادی صفراء ۱۵؍ گھنٹے میں پہنچے، یہاں قبر ابی ذر غفاری ہے (یہ صحیح نہیں ہے) یہاں سے بیر عباس ۱۴؍ گھنٹے وہاں سے بیر عار ۱۴؍ گھنٹے، کنواں فاصلہ پر ہے، یہاں سے ذوالحلیفہ ہوتے ہوئے مدینہ منورہ ۱۹؍ گھنٹے میں پہنچے۔

ناچیز کہتا ہے کہ اب اللہ تعالیٰ نے ایسا فضل فرمایا ہے اور ایسے وسائل پیدا کر دیئے ہیں کہ ۱۳۹۰ھ میں ہم فجر کی نماز کے بعد تقریباً ۷؍ بجے مکہ سے روانہ ہوئے اور اسی وادی فاطمہ و رابغ سے ہوتے ہوئے مدینہ منورہ پہنچے تو لوگ ظہر کی نماز پڑھ کر مسجد نبوی سے نکل رہے تھے، یہ سفر کار سے ہوا تھا، فالحمدللہ۔

حضرت مولانا خلیل احمد رحمۃ اللہ علیہ | مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں: ''آپ کو حق تعالیٰ نے سات حج نصیب فرمائے، جس میں پہلا سفر حج ۱۲۹۳ھ میں تنہا بھوپال سے، اور دوسرا ۱۲۹۷ھ میں بمعیت مولوی شمس الدین صاحب بھاولپور سے ہوا۔[1] باقی پانچ حج آپ کے ملازمت مظاہر علوم کے زمانہ میں سہارنپور سے ہوئے، پہلا ۱۹۴۳ء میں اہل کو ساتھ لے کر کہ ان کے پاس شوہر اول کا عطیہ زیور تھا، جس کو تقریباً ڈیڑھ سو روپیہ میں فروخت کر کے زمین خرید لی تھی اور پھر ۱۹۴۳ء میں اس کو بعوض پانچ سو روپیہ فروخت کر دیا۔ بیع کا تمام ہونا تھا کہ حضرت نے فرمایا تم پر حج فرض ہوگیا اس کے ادا کرنے کا اہتمام کرو، اگرچہ محرم بن کر صرف حج آپ بھی اس رقم میں کر سکتے تھے مگر آپ کے لیے سفر حج کا محرک جب کبھی ہوا وہ آستانۂ محمدیہ ﷺ کی حاضری کا شوق ہوا ہے، اس لیے آپ نے مطرقۃ الکرامہ کے نسخے یکمشت فروخت کرنے کی سعی کی کہ صرف وہی آپ کا راس المال تھا، اور اس کی رقم لے کر آپ مع اہلیہ اور اپنی بڑی لڑکی کے شوہر کے مجنون ہوجانے کے سبب محزون و مضمحل زیادہ رہتی اور اپنے بدن کا زیور فروخت کر کے والدین کے ساتھ عرب جانے کو تیار ہوگئی تھی، آخر شوال میں روانہ ہوئے اور بعد حج ۲۳ دن مدینہ منورہ میں قیام فرما کر صفر میں واپس وطن تشریف لے آئے۔

پھر ۱۳۲۸ھ میں حضرت مولانا رائے پوری کو آپ نے دہلی تک مشایعت فرما کر حجاز روانہ کیا تو شوق حاضری حرمین کا پھر غلبہ ہوا، اور شاہ زاہد حسین صاحب رئیس بیہٹ نے آپ سے خواہش کی کہ ساتھ تشریف لے چلیں تو آپ نے منظور فرمالیا، اور مولوی محمد یحییٰ صاحب کو اپنا قائم مقام بنا کر اہلیہ کو مکان پر چھوڑ کر وسط ذیقعدہ میں بمبئی روانہ ہوگئے، ۶ ر ذی الحجہ کو آپ مکہ پہنچے، اور ۱۰ ر محرم کو براہ رابغ مدینہ منورہ حاضر ہوئے، بائیس دن قیام فرما کر وطن کو مراجعت فرمائی، اور آخر صفر میں سہارنپور تشریف لے آئے، ان دونوں سفر میں بندہ کو ہمرکابی کا شرف نصیب ہوا، اور دوسرے سفر میں میرٹھ سے حافظ فصیح الدین صاحب مرحوم مع اہل اور ان کے بھائی الحاج وجیہ الدین صاحب مع والدہ و اہل و دیگر حضرات تقریباً سولہ نفر حضرت کے ساتھ ہوئے، جنھوں نے حضرت کا فوری قصد سن کر دفعۃً ارادہ کیا اور چل کھڑے ہوئے تھے، مولانا ظفر احمد صاحب اور مولانا عبداللطیف صاحب بھی مکہ مکرمہ میں حضرت کے ساتھ ہوگئے کہ روانگی دونوں صاحبوں کی رائے پوری قافلہ سے بھی قبل ہوچکی تھی، حکیم

(۱) تفصیل کے لیے تذکرۃ الخلیل ص ۶۶ و ص ۷۱ طبع اول ملاحظہ کیجئے

حافظ یعقوب صاحب اور آپ کی والدہ محترمہ دختر اعلیٰحضرت گنگوہی نے جو حضرت مولانا رائے پوری کے ساتھ گئی تھیں مکہ مکرمہ سے حضرت کی معیت اختیار کی۔

تیسرا سفر ۳۳ھ میں بماہ شوال اس وقت ہوا جب کہ ترکی و برطانیہ میں جنگ عظیم برپا تھی، اور طرح طرح کے فساد رونما تھے، دہلی سے آپ کے پاس ایک استفتا آیا تھا جس میں مسلمانانِ ہند کا ترکی سے جنگ کرنا جائز لکھ کر حضرت سے تصویب چاہی گئی اور آپ نے دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا اور آپ نے خاص لوگوں سے کہا اگر یہ دھمکی صحیح اور گورنمنٹ مجبور کرتی ہے کہ اسلام کے خلاف فتویٰ دیں تو ہندوستان میں رہنا جائز نہیں اور ہجرت کرنا فرض ہے، اپنے اس خیال کو آپ نے شائع تو نہیں کیا مگر خود ارادہ پختہ کر لیا کہ میں ایسی حالت میں ہندوستان کو دارالامن نہیں سمجھتا، حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ بھی سفر کا ارادہ فرما چکے تھے اور حضرت کا قصد مولانا کی معیت کا تھا، مگر مولانا کے سفر میں کچھ تاخیر ہوئی تو حضرت نے بایں اندیشہ کہ دستخط کرنے سے انکار کرنے پر کوئی فتنہ پیدا نہ ہو جائے انتظار کو پسند نہ کیا اور وسط شوال میں روانہ ہو کر ۲۲ر ذیقعدہ کو مکہ مکرمہ پہنچ گئے، بعد حج ۷ر محرم کو مدینہ منورہ پہنچ کر قیام فرما لیا، مگر وقت اتنا نازک تھا کہ آپ کے ساتھ خفیہ پولیس کی نگرانی تھی جو ہر حرکت وسکون کو قلمبند کرتی رہتی تھی۔ اور ادھر گورنمنٹ ٹرکی کو ان حضرات کی طرف سے برطانوی رعایا ہونے کی بنا پر بدگمانی ہوتی، چنانچہ آپ نے ترکی افسر سے فرمایا بھی کہ عجیب بات ہے برطانوی حکومت ہم کو بحیثیت اتحاد مذہب ترکی کا خیر خواہ سمجھ کر بدگمان ہے، اور ترکی حکومت محض ہندی باشندہ ہونے کے لحاظ سے ہم پر مطمئن نہیں، پھر آخر مسلمان اپنی مذہبی زندگی عافیت کے ساتھ گزارنے کے لیے کون سا ملک ڈھونڈیں۔ مگر اس کا کوئی جواب نہ ملا اور آخر آپ کو نو مہینہ بعد شعبان ۳۴ھ میں ہندوستان واپس آنا پڑا، بمبئی بندر پر اترے تو آپ کو روک لیا گیا اور سیاسی تحقیق کے لیے مع اہلیہ کے بالا بالا نینی تال بھیج دیا گیا، وہاں آپ سے طرح طرح کے سوالات ہوئے۔

چوتھا حج ۳۸ھ میں ہوا کہ آپ شعبان میں روانہ ہوئے اور شہرت ہوگئی کہ بہ نیت ہجرت تشریف لئے جا رہے ہیں، اس لیے عام بے چینی پھیل گئی، اور مہمانوں کی وہ کثرت ہوئی کہ الامان، مولوی محمد زکریا صاحب، مولوی منظور احمد صاحب، قاری عبدالعزیز صاحب اور مولوی لطیف الرحمٰن صاحب نے بھی عزم کر لیا، مولوی محمد اسحٰق مرحوم مولوی حبیب احمد نارنولی بھی ساتھ ہوئے، اور حضرت مع

اہلیہ وحاج مقبول احمد اپنے قافلہ کو لے کر شعبان میں بمبئی روانہ ہوگئے، قصد تھا کہ رمضان مکہ مکرمہ میں گزاریں مگر جہاز کی روانگی میں تاخیر ہوئی کہ جہاز میں چاند نظر آ گیا اور ۱۱رمضان کو مکہ مکرمہ پہنچے، یہ زمانہ شریف حسین کی حکومت کا آخری نازک زمانہ تھا کہ استبداد وخودداری اپنا سکہ جما رہی اور علماء ہند کی مقتدر ہستیاں مشتبہ نظروں سے دیکھی جاتی تھیں، مولانا محمود حسن صاحب گرفتار ہوکر مالٹا پہنچ گئے تھے، اندرون ملک میں عام ناراضی پھیلی ہوئی تھی، اس لیے آپ نے اپنے قافلہ کو مدینہ منورہ بھیج دیا کہ نہ معلوم کیا مقدر ہے تم لوگ پہلی مرتبہ آئے ہو زیارت آستانہ سے محروم نہ جاؤ اور خود مکہ مکرمہ ٹھہرے رہے، ایک دن حرم شریف میں نماز کا سلام پھیرا اور ایک شخص نے کہ نہ معلوم مجنون تھا یا مغلوب الحال شور مچانا شروع کیا ''قیامت ٹوٹے اور آسمان پھٹے اس حکومت پر کہ مولوی خلیل احمد جیسے محترم مقتدی ہوں اور یہ ایسا ویسا شخص امام بنے'' وغیرہ وغیرہ جو منھ میں آیا کہا، اس شخص کے تو اگلے دن مرنے کی اطلاع ملی، اور حضرت کے متعلق اندیشہ ہوا کہ شریف کو سب اطلاع مل چکی ہے عجب نہیں آپ پر بھی ہاتھ صاف ہو، آپ کو یہ بھی گوارہ نہ تھا کہ مسلمان حاکم کی شکایت انگریزی قنصل سے کر کے پناہ لیں، ورنہ سکون سے رہنا نصیب تھا کہ خدا جانے اس کے بعد کیا فتنہ برپا ہو، اس لیے مولوی محبّ الدین صاحب کے اصرار پر کہ ہندوستان جلد جاؤ آپ آخر محرم ۳۹ھ میں روانہ ہوکر شروع صفر میں سہارنپور پہنچ گئے۔

آپ پانچویں حج کو جو کہ عمر شریف کا ساتواں حج تھا ۱۶رشوال کو حیدرآباد ہوتے ہوئے بمبئی گئے اور تقریباً دوسو رفقاء کے امیر بن کر زیانی جہاز میں حجاز روانہ ہوئے، بعد حج ۱۴رمحرم کو مدینہ منورہ داخل ہوئے اور یہ داخلہ وہ تھا جس کے بعد خروج کا صرف وہی وقت ہے جب کہ سرور عالم وعالمیان ﷺ اپنے پڑوسیوں کے امیر بن کر صلہ وانعام دلانے کے لیے بارگاہِ واہب العطیات کی طرف قدم اٹھائیں گے۔

اس ساتویں حج میں حضرت کے ساتھ صدہا خدام ومتوسلین کا مجمع رہا جن کو حضرتؒ نے حج مبرور ومسنون کا عملی سبق پڑھایا، زیادہ تر حضرت کے رفیق سفر علماء ہوئے اور یہ دیکھ کر کہ حج جیسی عبادت میں جو کہ عمر بھر میں ایک مرتبہ فرض ہے حضرت کو ان جزئیات کا ہر وقت اور تمامی سنن ومستحبات کی پوری رعایت کا اہتمام رہتا ہے جن کی طرف اچھے اچھے مولویوں کی نظر بھی نہیں جاتی وہ حیران ہوجایا کرتے تھے، طواف کی دو رکعت کے بعد استلام حجر اسود گویا آج کل متروک ہے مگر فقہاء نے اس کے استحباب کی تصریح کی ہے میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ حضرت نے ترک فرمایا ہو، ۱۳رذی الحجہ کو منیٰ سے

واپسی میں محصب پر نزول حضرت کا کبھی نہیں چھوٹا حالانکہ اکثر حجاج محصب سے واقف بھی نہیں کہ کہاں ہے، ۹ ؍ کو منیٰ سے چلنے میں آپ کی نظر جبل ثبیر پر رہتی اور جب سورج کی شعاع اس پر چمکتی اور اشرق ثبیر کا مصداق نظر آتا تو آپ عرفات کی طرف متوجہ ہوتے، اسی طرح واپسی میں مزدلفہ پر صبح کی نماز غلس میں پڑھتے اور بیٹھے رہتے حتیٰ کہ اسفار ہوتا اور اس وقت آپ منیٰ ہو کر سیدھے جمرۃ العقبہ پر رمی کے لیے پہنچتے تھے، ایک مرتبہ باب مکہ کے قریب پہنچ کر آپ نے فرمایا کہ مسنون راستہ حجون کا ہے چلو سنت ادا کریں، چنانچہ آپ نے قافلہ چھوڑ دیا اور پہاڑیوں کو قطع کرتے ہوئے جنت المعلی کے متصل نکل کر باب السفلی سے مکہ میں داخل ہوئے، مجھے اسی دن علم ہوا کہ حجون کیا ہے اور اس کا راستہ کون سا ہے، دخول کے لیے غسل کا آپ نے اہتمام فرمایا اور شہر سے باہر قہوہ خانہ میں ٹھہر کر ۴ ؍ کو ایک کنستر پانی خرید فرما کر غسل کیا۔ ۹ ؍ ذی الحجہ کو عرفات میں بھی غسل کا اہتمام فرمایا اور روزہ تو رکھا نہیں مگر ایک پیالی چائے کے سوا کچھ کھایا بھی نہیں کہ صوم عرفہ اور افطار فی العرفات کو جمع فرمایا، رمی جمار کے بعد آپ کا وقوف دعا کے لیے باوجود اتنی دھکا پیل کے کہ جوانوں کا پاؤں جمنا مشکل تھا ہمیشہ ہوا اور مسنون مقدار تک ہوا کہ کمی نہیں آئی، فتنہ وسکون اور قلت وکثرت حجاج، گرمی، سردی، برسات، غرض ہر موسم میں اور مختلف طبیعت والے اشراف و والیان کے زمانۂ حکومت میں آپ کو اسفار حج پیش آئے مگر یہ امر مشترک کہ حج بطریق مسنون ادا ہو کسی وقت کے کسی حج میں بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹا، نماز تو آپ کی ہر جگہ آپ کی قرۃ العین تھی پھر کیا پوچھنا نماز مسجد الحرام کا، کہ آپ کے صدہا رفیقوں میں کوئی ایک بھی نہیں بتا سکتا کہ فلاں نماز میں آپ کی تکبیر تحریمہ یا صف اول یا امام کی جانب یمین آپ سے فوت ہوئی ہو، سخت گرمی میں جب کہ فرش صحن پر پاؤں رکھنے سے چھالے پڑتے تھے آپ ظہر میں انگلیوں کے بل تیز چل کر مصلی حنفی پر پہنچتے اور صف اول میں امام کا قرب لیا کرتے تھے، مجھے خوب یاد ہے ایک مرتبہ بعد مغرب بارش خوب زور کی ہوئی اور رفقاء کی زبانوں پر آیا الا صلوا فی الرحال پر عمل کا وقت حق تعالیٰ نے دکھایا مگر حضرت نے اذان کی آواز کان میں پڑتے ہی مجھ سے فرمایا چلو بھئی نماز کو، ہر چند کہ میری ہمت بھی پست تھی مگر لالٹین ہاتھ میں لے کر ساتھ ہولیا اور حضرت نے پانی بھرا ہوا لوٹا ہاتھ میں اٹھایا، میں بالکل نہ سمجھا کہ باوضو ہوتے ہوئے اس کی کیا ضرورت ہے، مگر حضرت نے فرمایا ممکن ہے پاؤں کو کیچڑ لگے اس لیے دروازہ پر پاؤں دھولیں گے کہ حرم شریف ملطخ نہ ہو، اس سے قبل مجھے مکہ کی کیچڑ اور بارش دیکھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا

تھا، نیچے اتر کر سڑک پر آئے تو زمین پاؤں کو پکڑ لیتی تھی، ہر قدم پر میری تمنا ہوتی تھی کہ کاش حضرت رخصت پر عمل فرماویں، اور سمجھتا تھا کہ حضرت بھی اس تکلیف کو برداشت نہ کرسکیں گے مگر ہر قدم حضرت کا مجھ سے آگے رہا، ہر ایک کے سر پر چھتری جدا تھی اور میرے ہاتھ میں لالٹین تو حضرت کے ہاتھ میں پانی کا بھرا ہوا لوٹا، بازار ختم ہوا تو سڑک پر تا دیوارِ مسجد الحرام پچیس تیس فٹ پھاٹ کا دریا بہہ رہا تھا اور اس زور سے پانی چل رہا تھا کہ دیکھ کر ڈر معلوم ہوتا تھا، یہاں حضرت ٹھہرے اور میں سمجھا کہ اب واپسی کا حکم فرمائیں گے، مگر حضرت بولے چھتریاں تو اب کرلو بند، اور پائنچے لو چڑھا، جوتے لے لو بغل میں، اور ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال لو کہ سنا ہے رو میں پتھریاں آتی ہیں، اور گر جانے کا ڈر رہتا ہے وہ پیارا منظر بھی اب تک نظر کے سامنے ہے کہ برہنہ پا گھٹنوں تک پائنچے چڑھائے قینچی کی طرح باہم ہاتھ ملائے چھتریاں بازو پر لٹکائے چلے، اور **بسم اللہ مجریھا** کہہ کر رو میں قدم ڈال دیئے، چونکہ نشیب کا رخ تھا اس لیے چھوٹی کنکریاں پانی کے ساتھ بہتی ہوئی اس زور سے آتی تھیں جیسے مٹھیاں بھر کر کوئی گولیاں مارتا ہے، آگے بڑھے تو گھٹنوں تک پانی آ گیا اور قریب تھا کہ میرا پاؤں پھسلے، مگر حضرت نے بازو تھام رکھا تھا کہ گرنے نہ دیا اور خدا خدا کر کے باب الصفا پر چڑھے، وہاں پہنچ کر پہلی سیڑھی پر اول پاؤں دھوئے اور بوّاب کی الماری میں جوتے رکھے، اس کے بعد **اللّٰھم افتح لی ابواب رحمتک** پڑھ کر حضرت نے مسجد میں قدم رکھا اور میں حضرت کا اتباع کرتا رہا، نماز پنجگانہ کے اہتمام کی خاطر حضرت کبھی جبل ثور پر نہیں گئے، حالانکہ شوق ظاہر فرماتے اور کہا کرتے تھے کہ بھئی ہر چیز بدل گئی اور تیرہ سو برس میں وہ زمین جس پر آنحضرت ﷺ کے قدم مبارک پڑا کرتے تھے خدا جانے کتنے گز نیچے دب گئی مگر دنیا میں دو چیزیں ابھی موجود ہیں جس کو جسد محمدیؐ کے مَس کی عزت حاصل ہوئی ہے، ایک حجر اسود، دوم غار ثور کے پتھر، کہ یہی حجر اسود ہے جس کو جناب رسول اللہ ﷺ کے لبہائے مبارک لگے تھے، اور غار ثور کے پتھر بھی ابھی تک وہی پتھر ہیں جن سے مس کرتا ہوا آپ کا بدن غار میں پہنچا تھا، مگر دور ہے اور فجر کے بعد چل کر ظہر تک آ جانا کہ حرم شریف کی نماز فوت نہ ہو طاقت سے باہر ہے، اس لیے ہمت نہیں ہوتی، میں نوجوان تھا اور سمجھتا تھا کہ تیز چلنا کون دشوار ہے ایک قدم رکھا اور دوسرا اٹھایا، اس لیے حضرت سے عرض کیا کہ مجھے اجازت ہو تو میں ہو آؤں، حضرت کو معلوم تھا کہ تیز رفتار ہوں اس لیے ذرا سکوت فرما کر کہا بہتر ہے، دیکھو ایک لاکھ نماز کا ثواب نہ جاتا رہے، میں نے کہا نہیں حضرت

انشاء اللہ سویرے واپس آؤں گا، غرض سبھی کو راضی کیا کہ راہبر بن کر چلے اور دس بارہ نوجوان رفقاء ساتھ ہوئے تو ان سے بھی کہہ دیا کہ فجر شافعی کا سلام پھیرتے ہی چل پڑیں گے، مگر صبح ہوئی تو ندارد، چونکہ عزم کر چکا تھا اس لیے بنام خدا رفقاء کو ساتھ لے خود نکل کھڑا ہوا کہیں کہیں راستہ پوچھا اور آخر انصاب دیکھ کر سمجھ لیا کہ یہ راہ ثور کی علامات ہیں، قدم اٹھا کر تیز چلا، تین میل چل کر تین ہی میل جبل کی چڑھائی ختم کی اور نصف گھنٹہ غار میں لیٹ بیٹھ کر واپس ہوا اور اپنی انتہائی رفتار پر قدم ڈالے کہ ایک رفیق بھی ساتھ نہ رہ سکا، مگر افسوس کہ دروازۂ حرم پر قدم رکھتے ہی مکبر کی آواز آئی **السلام علیکم ورحمۃ اللہ** گھٹنے ٹوٹ گئے اور وہیں بیٹھ گیا، بعد میں حضرت سے ملا تو فرمایا بس اسی اندیشہ سے تو میری ہمت کبھی نہ ہوئی۔

مکہ کی گرمی مشہور ہے اور ایسی گرمی کا زمانہ حضرت نے وہاں گزارا ہے جو ناقابل برداشت تھی، ہر چند آپ کے مطوف اور رفقاء نے اصرار کیا کہ چند روز کے لیے طائف تشریف لے چلیں، مگر آپ نے جب فرمایا یہی فرمایا کہ بھئی ہندوستان چھوڑ کر تو مسجد الحرام ہی کی خاطر آتے ہیں، اس کو چھوڑ کر طائف جائیں تو ہندوستان ہی چھوڑنا کیا ضرور تھا، سیر کے لیے تو وہاں بھی شملہ ومنصوری موجود ہے، ہم تو جاتے نہیں، دکھ سکھ گزر ہی جائے گی، میں نے یہ بھی دیکھا کہ حضرت حرم شریف میں داخل ہوتے وقت اعتکاف کی نیت فرماتے اور اس کو نہایت ہی برا سمجھتے تھے کہ حرم شریف کو راستہ بنایا جائے، کہ چکر سے بچنے کے لیے مثلاً باب العمرۃ کے پاس والے مسجد میں عبور کر کے سوق شامی یا باب السلام کے راستہ سے نکل کر بازار جائیں، اسی طرح کسی مسجد کو تماشا گاہ بنانا حضرت کو بہت ناپسند تھا، دار الطلبہ کی مسجد کلثومیہ تیار ہونے پر بعض عورتیں پردہ کرا کے دیکھنے آئیں تو آپ نے فرمایا کہ جو وہاں جائے تحیۃ المسجد ضرور پڑھے۔

ہر سفر میں ایک دو دن کا اعتکاف بھی آپ مسجد الحرام میں ضرور کرتے اور زمزم شریف خاص رغبت واحترام کے ساتھ چاہ پر حاضر ہو کر ڈول سے جھک کر پیا کرتے تھے، ایک مرتبہ مولوی محبّ الدین صاحب کے خلوہ میں معتکف تھے اور بندہ ساتھ تھا کہ تہجد سے فارغ ہو کر فرمایا چلو آج زمزم کا سب سے پہلا ڈول پئیں گے، سنا ہے اس میں خالص کچے دودھ کا مزہ آتا ہے، چنانچہ چاہ پر پہنچ کر دیر تک انتظار کیا اور قفل کھلتے ہی اندر تشریف لے جا کر پہلا ڈول اول خوب شکم سیر ہو کر خود پیا اور پھر مجھے پلایا، زمزم پلانے والے جو مسجد میں پھرتے تھے کہ پلا کر پیسے مانگتے تھے، ان سے پانی لینا آپ کو پسند نہ تھا اور فرمایا کرتے کہ یہ تو بیع وشرا ہے جو مسجد میں حرام ہے، خصوصاً مسجد الحرام میں، کاش جبر نہ کیا

کریں کہ پلانا ان کے لیے ثواب ہو اور صدقہ دینا معطی کے لیے سبب اجر، مگر جبر کی صورت نے اس کو خرید وفروخت بنادیا جس سے معطی بھی غافل ہیں کہ نیکی برباد گناہ لازم کے مصداق بنتے ہیں، اپنے دوستوں کو صاحبزادہ مولانا محمد حسن [1] کی طرف متوجہ فرماتے کہ مسائل حج میں جو کچھ پوچھنا ہو صرف مولانا سے پوچھنا اور خود بھی پابندی کے ساتھ مولانا کے پاس آتے اور کسی مسئلہ میں کوئی اشکال پیش آتا تو حل فرمایا کرتے تھے، یہ بھی فرمایا کہ مولانا کو مسائل کے جزئیات اتنے مستحضر ہیں کہ آج کوئی نظیر نظر نہیں آتی، مولانا نے مناسک حج میں سات برس کے اندر ایک رسالہ غنیۃ الناسک تالیف فرمایا تھا، حضرت نے اس کو تقاضا کے ساتھ نقل کروایا اور جب بندہ حاضر حرمین ہوا تو تاکید فرمائی کہ نقل اپنے ساتھ ضرور لیتے آنا۔ چنانچہ بندہ نے نقل کا خود مولانا کے ساتھ اصل سے مقابلہ کیا اور ساتھ لاکر حضرت کی خدمت میں پیش کیا، حضرت نے بعض احباب کو ترغیب دے کر سو سو نسخے کا حصہ دار بنایا اور ایک حصہ خود لیا، اور اس کو طبع کرایا کہ محفوظ ونافع ہے کیونکہ موجودہ ضروریات کے لیے مناسک حج میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں، حضرت فرمایا کرتے تھے کہ حج میں مسلمان اتنا روپیہ خرچ کرتے اور اتنی مشقت اٹھاتے ہیں، مگر افسوس کہ حج کو بطریق مسنون ادا کرنے کی کوشش نہیں کرتے کہ سارا روپیہ اور محنت ٹھکانے لگے، عوام جب حج کو جاتے تو حضرت تاکید فرماتے کہ کسی دیندار فقیہ عالم کی مرافقت تلاش کرو اور علماء جاتے تو آپ وصیت فرماتے کہ یہ جدید مطبوعہ مناسک ضرور اپنے ساتھ رکھو، اور شروع سے جس نسک کا وقت قریب ہو اس کا باب دیکھنا اور بار بار مطالعہ کرنا لازم کرلو، مولانا محمد حسن صاحب کا زہد ہے کہ سال بھر میں پچاس روپئے سے زیادہ خرچ نہیں رکھتے اور توکل کہ کسی سے بطمع ملنا بھی پسند نہیں کرتے، اور استقامت کہ باوجود ضعفِ بصر اور زمانہ پیری کے نماز کی تکبیر تحریمہ فوت نہیں ہوتی تھی، حضرت کی نظروں میں بڑا پیارا تھا، اور حضرت فرمایا کرتے تھے، کہ بس ہجرت تو ایسے لوگوں کی ہے، حضرتؒ کے کچھ ہی دنوں بعد مولانا نے بھی وصال فرمایا، اور غنیۃ الناسک اپنی یادگار باقیات صالحات چھوڑ کر جنت المعلیٰ میں دفن ہوئے فرحمه الله واطاب ثراه.

یہ ساری تفصیلات تذکرۃ الخلیل مولفہ حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی سے لی گئی ہیں۔ حضرت مولانا خلیل احمد کی وفات ۱۳۴۶ھ میں ہوئی، اور مدینہ منورہ میں مدفون ہیں۔

---

(۱) حضرت ممدوح علاقہ سوات کے باشندے حضرت گنگوہی کے شاگرد، عرصہ سے مہاجر ومقیم مکہ تھے، فقہ میں بالخصوص مناسک حج کی واقفیت میں بے مثل تھے۔

اذان اوراس کا جواب

اذان کی آواز ہر وقت فضاء میں گونجتی ہے

از: مولانا ظفر احمد صاحب قاسمی استاذ شعبۂ ادب عربی مدرسہ بیت العلوم سرائے میر

اذان دینِ اسلام کے شعائر، اس کی نشانیوں اوراس کی علامتوں میں سے ہے، جس شہر جس گاؤں اور جس جگہ سے اذان کی آواز بلند ہوتی ہے، اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہاں پر اللہ کی الوہیت کا اقرار کرنے والے اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت کی گواہی دینے والے موجود ہیں، اور وہاں کے لوگ شب وروز پانچ وقت اللہ کے حضور سربسجود ہوتے ہیں اور اپنی بندگی کا اظہار کرتے ہیں، اذان ہر ایک مسلمان کو دنیا کی صلاح اور آخرت کی فلاح کی دعوت دیتی ہے، اسی لیے اس کو دعوت تامہ یعنی مکمل دعوت کہا گیا ہے۔

اذان کی ابتدا مدینہ منورہ سے ہوئی، مدینہ کے انصار نے جب اسلام کی دعوت کو قبول کرلیا، اسلام اور رسول اللہ اور ان کے پیروکاروں کی نصرت ومدد کے لیے تیار ہوگئے، تو رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے مسلمان مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے لگے، اور پھر اخیر میں رسول پاک ﷺ نے اپنے ساتھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہجرت فرمائی، حضرت رسول پاک ﷺ نے مدینہ منورہ میں سب سے پہلے مسجد تعمیر فرمائی تا کہ مسلمان آزادانہ اور اجتماعی طور پر پانچ وقت نماز ادا کرسکیں، ہر ایک کی خواہش ہوتی کہ رسول اللہ ﷺ کی اقتدا میں ان کے پیچھے نماز ادا کرے، چونکہ اس وقت تک نماز کے اوقات بتانے کا ابھی کوئی طریقہ ایجاد نہیں ہوا تھا، اس لیے جماعت کے شوق میں بہت سے لوگ پہلے سے آ کر انتظار کرتے اور انتظار کی زحمت اٹھاتے اور ایسے ہی کچھ لوگ جماعت ختم ہونے کے بعد آتے تو جماعت کے چھوٹنے کا افسوس وقلق ہوتا۔

نبی کریم ﷺ نے اس معاملہ میں صحابہ کرام سے مشورہ کیا کہ کیونکر لوگوں کو نماز کے وقت کی اطلاع دی جائے، کسی نے اونچی جگہ پر آگ جلانے کا مشورہ دیا، کسی نے ناقوس اور قرن بجانے کا مشورہ دیا، کسی نے مشورہ دیا کہ الصلوٰۃ جامعۃ کی ندا گلیوں میں لگائی جائے، غرض کسی بات کا حتمی طور پر فیصلہ نہیں ہوا

حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ رضی اللہ عنہ نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص ناقوس لیے ہوئے ہے تو انھوں نے ان سے کہا اے اللہ کے بندے کیا تم اس ناقوس کو فروخت کروگے؟ اس نے پوچھا تم اس کا کیا کروگے؟ وہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ ہم اس کو نماز کے وقت بجائیں گے تاکہ لوگ جمع ہوجائیں، تو اس نے کہا کیا میں اس سے اچھی چیز تم کو نہ بتادوں، پھر اس نے کلماتِ اذان بتایا، صبح صبح جاکر رسول اللہ ﷺ سے انھوں نے اپنا خواب ذکر کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "انها لرؤیا حق ان شاء الله" کہ یہ صحیح اور سچا خواب ہے ان شاء اللہ، تم بلال کو یہ کلمات تلقین کردو اور وہ اذان دیں کیونکہ ان کی آواز تم سے بلند ہے۔
حضرت عبداللہ بن عبدربہ کہتے ہیں کہ میں حضرت بلال کو کلمات اذان بتانے لگا اور وہ بلند آواز سے ان کو کہنے لگے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو اپنے گھر پر تھے، ان کلمات کی آواز کو سنا تو اپنی چادر گھسٹتے ہوئے جلدی سے رسول پاک ﷺ کے پاس آئے اور فرمایا یارسول اللہ ﷺ میں نے بھی یہی خواب دیکھا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے الحمدللہ فرمایا۔ (مشکوٰۃ شریف: ۶۴) اس طرح اذان کی ابتدا ہوئی، اور جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں وہاں سے روزانہ پانچ مرتبہ یہ آواز بلند ہوتی ہے، اس وقت سے لے کر اب تک بلکہ قیامت تک یہ آواز فضا میں گونجتی اور بلند ہوتی رہے گی اور اللہ کی بڑائی و حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت کا اعلان ہوتا رہے گا، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ہر لمحہ اور ہر آن اذان کی آواز دنیا کی فضا میں گونجتی رہتی ہے تو یہ کوئی مبالغہ نہ ہوگا، بلکہ ایک حقیقت کا اظہار ہوگا۔ یہ زمانہ سائنس، تجربات اور تحقیقات کا زمانہ ہے، تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ فضا میں گونجنے والی اور بلند ہونے والی سب سے زیادہ آواز اذان کی آواز ہے، جو ہر وقت کہیں نہ کہیں سے بلند ہوتی رہتی ہے، آیئے اسی بات کو ذرا تفصیل سے جان لیں تو بڑی فرحت و مسرت کا سبب ہوگا، دیکھئے اسلامی احکام روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ کا تعلق قمری ماہ و سال سے ہے، لیکن نماز جو اسلام کا عظیم رکن ہے اس کا تعلق سورج سے ہے، اور سورج چوبیس گھنٹہ میں پورے کرۂ ارض کا چکر لگاتا ہے جس سے زمین کے کسی حصہ پر صبح، کہیں شام، کہیں دن اور کہیں دوپہر کا وقت ہوتا ہے، اسی کے اعتبار سے وہاں نماز کے اوقات آتے ہیں اور ہر نماز کے لیے اذان ہوتی ہے تو اذان بھی مختلف اوقات میں ہوتی رہے گی۔

دنیا کے نقشہ پر ایک نظر ڈالی جائے تو انڈونیشیا کرۂ ارض کے مشرق میں واقع ہے، اس ملک میں دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی ہے، یہاں مسلمانوں کی تعداد دنیا کے ہر خطہ سے زیادہ ہے، یہ ملک بے شمار جزائر پر مشتمل ہے، جن میں جاوا، ساترا، بورنیو اور سلیز مشہور جزیرے ہیں، جب صبح صادق سلیز کے مشرق میں واقع جزائر میں ہوتی ہے، تو اس وقت وہاں صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے ہوتے ہیں، صبح صادق

کے ہوتے ہی انڈونیشیا کے انتہائی مشرقی جزائر میں فجر کی اذان شروع ہوجاتی ہے اور ہزاروں مؤذن اللہ تعالیٰ کی توحید اور جناب رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اعلان کر رہے ہوتے ہیں، یہ سلسلہ مشرقی جزائر سے مغربی جزائر تک بڑھتا رہتا ہے اور ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد جکارتہ کے مؤذنوں کی آواز فضا میں گونجنے لگتی ہے، جکارتہ کے بعد یہ سلسلہ سماٹرا میں شروع ہوجاتا ہے اور سماٹرا کے بعد مغربی قصبوں اور دیہاتوں سے پہلے ملایا کی مسجدوں سے اذان کی آوازیں بلند ہونے لگتی ہیں، ملایا کے بعد برما کی باری آتی ہے، جکارتہ سے اذانوں کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ ایک گھنٹہ بعد ڈھاکہ یعنی بنگلہ دیش پہنچتا ہے، بنگلہ دیش میں ابھی اذانوں کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہوتا کہ کلکتہ سے لے کر سری نگر کشمیر تک اذانیں گونجنے لگتی ہیں، دوسری طرف یہ سلسلہ کلکتہ سے بمبئی کی طرف بڑھتا ہے اور پورے ہندوستان کی فضا توحید و رسالت کے اعلان سے گونج اٹھتی ہے، سری نگر اور سیالکوٹ پاکستان میں فجر کی اذان کا ایک ہی وقت ہے، سیالکوٹ سے کوئٹہ کراچی اور گوادر تک چالیس منٹ کا فرق ہے، اس عرصہ میں پاکستان کی فضا میں اذان کی آواز گونجتی رہتی ہے۔

پاکستان میں یہ سلسلہ ختم ہونے سے پہلے افغانستان اور مسقط میں اذانوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، مسقط سے بغداد تک ایک گھنٹہ کا فرق ہے، اسی عرصہ میں اذانیں حجاز مقدس، یمن، عرب امارات، کویت اور عراق میں گونجتی رہتی ہیں، بغداد سے اسکندریہ تک پھر ایک گھنٹہ کا فرق ہے اسی دوران شام، مصر، صومالیہ اور سوڈان میں اذانیں بلند ہوتی رہتی ہیں، پھر ایک ساتھ اسکندریہ اور استنبول میں اذانیں ہوتی رہتی ہیں، کیونکہ یہ دونوں ایک ہی طول و عرض پر واقع ہیں، مشرقی ترکی سے مغربی ترکی تک ڈیڑھ گھنٹہ کا فرق ہے، اس دوران ترکی میں صدائے توحید و رسالت بلند ہوتی ہے اسکندریہ سے طرابلس تک ایک گھنٹہ کا فاصلہ ہے، اس عرصہ میں شمال افریقہ میں لیبیا اور تونس میں اذانوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

فجر کی اذان جس کا آغاز انڈونیشیا کے مشرقی جزائر سے ہوا تھا، ساڑھے نو گھنٹے کا سفر طے کر کے بحر اوقیانوس تک پہنچنے سے قبل ہی مشرقی انڈونیشیا میں ظہر کی اذان کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، اور ڈھاکہ میں ظہر کی اذانیں شروع ہونے تک مشرقی انڈونیشیا میں عصر کی اذانیں شروع ہوجاتی ہیں، یہ سلسلہ ڈیڑھ گھنٹہ تک بمشکل جکارتہ پہنچتا ہے کہ انڈونیشیا کے مغربی جزائر میں مغرب کا وقت ہوجاتا ہے، مغرب کی اذانیں سلیز سے بمشکل سماٹرا تک پہنچتی ہیں کہ اتنے میں عشاء کا وقت ہوجاتا ہے، جس وقت مشرقی انڈونیشیا میں عشاء کی اذانوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو اس وقت امریکہ میں فجر کی اذانیں گونجنے لگتی ہیں۔

آپ نے دیکھا کرۂ ارض پر ایک سیکنڈ بھی ایسا نہیں گذرتا کہ جس وقت ہزاروں لاکھوں

مؤذن بیک وقت اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسول ﷺ کی رسالت کا اعلان نہ کررہے ہوں، یہ اللہ تعالیٰ کے قول "ورفعنا لک ذکرک" کی معجزاتی تفسیر ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کی خاطر ان کے ذکر کو وہ رفعت وبلندی عطا فرمائی کہ اللہ کے نام کے ساتھ اللہ کے حبیب کا نام بھی اذان میں ہر جگہ اور ہر وقت لیا جاتا ہے۔

دنیا میں اللہ کی توحید اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی آواز بلند کرنے والے یہ حضرات مؤذن اللہ کے نزدیک بڑی فضیلت والے ہیں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے حضرت رسالت مآب ﷺ سے خود سنا کہ آپ فرماتے تھے کہ اذان کہنے والے قیامت کے دن دوسرے سب لوگوں سے اونچی گردن والے ہوں گے۔ (مسلم شریف) نیز رسول پاک ﷺ نے فرمایا کہ مؤذن کی آواز جہاں تک جاتی ہے وہاں تک کی ساری چیزیں اور انسان وجن سب اس کے لیے قیامت میں گواہی دیں گے۔ (بخاری شریف)

رسول اللہ ﷺ نے مؤذن کے لیے مغفرت کی دعا فرمائی ہے، ترمذی شریف کی ایک حدیث میں ہے جس نے سات سال تک محض اللہ کی رضا اور حصول ثواب کے لیے اذان دی تو اس کے لیے جہنم سے برأت لکھ دی جاتی ہے۔ اذان شعار اسلام وایمان میں سے ہے، اس واسطے اس کا بہت احترام کرنا چاہئے اور ہر سننے والے مسلمان کو اس کا جواب دینا چاہئے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم مؤذن کو سنو تو تم بھی اسی طرح کہو، یعنی اس کی اذان کا جواب دو، پھر مجھ پر درود پڑھو جو شخص مجھ پر ایک بار درود پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس مرتبہ رحمت بھیجے گا، پھر میرے لیے وسیلہ کی دعا کرو یہ جنت میں ایک ایسا مقام ہے جو صرف اللہ کے ایک بندہ کو حاصل ہوگا اور مجھے امید ہے کہ وہ میں ہی ہوں گا، تو جس نے میرے لیے وسیلہ طلب کیا اس کے لیے میری شفاعت حلال ہوجائے گی۔ (مسلم بحوالہ مشکوٰۃ: ۶۵)

اذان اور اذان کا جواب کتنا مختصر عمل ہے اور اس کے کتنے فضائل ہیں، مگر ہمارے اندر ایسی غفلت ہوتی ہے کہ نہ اذان کا جواب دیتے ہیں اور نہ اس کے بعد کی دعا پڑھتے ہیں، بلکہ دنیا کے کاموں اور اس کی باتوں میں لگے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت دے اور اس اسلامی شعائر کے قدر کی توفیق دے۔ (آمین)

(بشکریہ: فیضان اشرف)

أحكام السواک

مسواک کے احکام اور اس کے فضائل

(دوسری قسط)

للدکتور: عبداللّٰہ بن معتق السهلي

ترجمہ: مولانا فریدالحق صاحب
استاذ مرقاۃ العلوم، مئو

چھٹی بحث
روزہ دار کے لیے مسواک کا حکم

روزہ دار کے لیے مسواک کرنے کی دوصورت ہے: ایک قبل الزوال دوسرے بعد الزوال، پہلی صورت میں بالاتفاق فقہاء کرام مسواک کو جائز قرار دیتے ہیں، دوسری صورت میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے اوراس میں دوقول ہیں، پہلاقول یہ ہے کہ روزہ دار کے لیے مطلقاً دن کے کسی حصہ میں خواہ شروع کا ہو یا اخیر کا مسواک کرنا جائز ہے، اس میں کوئی قباحت اور کراہت نہیں۔ اور یہ حضرت عمر، ابن عباس، وعائشہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، اور یہی امام ابوحنیفہؒ و مالکؒ اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے، امام نووی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، علامہ ابن القیم اور علامہ شوکانیؒ نے بھی اسی قول کو پسند کیا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ روزہ دار کے لیے زوال کے بعد مسواک کرنا مکروہ ہے، اور یہ عطاء، مجاہد، اسحاق وابوثور سے مروی ہے اور یہی امام شافعیؒ کا قول ہے، مشہور مذہب کے مطابق امام احمدؒ بھی اسی کے قائل ہیں۔

قول اول والوں کے دلائل:

قائلین قول اول نے ان احادیث سے استدلال کیا ہے جس میں مسواک کو بغیر کسی وقت کی قید کے مسنون قرار دیا گیا ہے، ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱:-حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث: اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: **لو لا أن أشق على أمتي او على الناس لأمرتهم بالسواک مع کل صلوٰۃ** ، اگر میری امت یا لوگوں پر مسواک کرنا گراں نہ ہوتا، تو میں ضرور انھیں مسواک کا حکم کرتا، اس حدیث میں ہر نماز کے وقت مسواک کا حکم بیان کیا ہے جو ظہر، عصر، اور مغرب کی نماز کو بھی شامل ہے خواہ اس کا پڑھنے والا روزہ دار ہو یا غیر روزہ دار۔

۲:-حضرت عائشہؓ کی حدیث: اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی گھر کے اندر داخل ہوتے تو سب سے پہلے مسواک کرتے **ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا دخل بیتہ بدأ بالسواک.**

یہ حدیث اپنے عموم کی بنا پر یہ بیان کرتی ہے کہ آپ ﷺ جب بھی گھر میں داخل ہوتے چاہے زوال سے پہلے یا زوال کے بعد، روزہ سے ہوں یا نہ ہوں ہر حال میں مسواک فرماتے تھے۔

۳:-حضرت عائشہؓ کی حدیث: **ان النبی ﷺ قال: السواک مطهرة للفم مرضاة للرب** کہ مسواک منھ کی صفائی کا ذریعہ اور اللہ کو راضی کرنے کا سبب ہے۔

اس حدیث میں بغیر کسی وقت کی تعیین کے مسواک کی ترغیب دی گئی ہے جو قبل الزوال اور بعد الزوال دونوں کو شامل ہے۔

۴:-عامر بن ربیعہؓ کی حدیث: وہ فرماتے ہیں **رأیت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ما لا احصی یتسوک وھو صائم** (بخاری ج۲ص۲۳۴)

کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو حالت صوم میں اتنی کثرت کے ساتھ مسواک کرتے ہوئے دیکھا ہے کہ اس کو شمار نہیں کرسکتا۔

یہ حدیث اس باب میں بالکل واضح ہے کہ روزہ دار دن میں کسی وقت بھی مسواک کرسکتا ہے قبل الزوال اور بعد الزوال کی کوئی قید نہیں۔

۵:-عبدالرحمٰن بن غنمؓ کی حدیث: وہ فرماتے ہیں کہ میں نے معاذ بن جبلؓ سے پوچھا **أأتسوک وأنا صائم** کیا میں مسواک کروں جب کہ روزہ سے ہوں؟ معاذ بن جبلؓ نے فرمایا **نعم**، ہاں، میں نے کہا کہ لوگ شام کے وقت حالت صوم میں مسواک کو مکروہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے: **لخلوف فم الصائم أطیب عنداللّٰہ من ریح المسک**، کہ روزہ دار کے منھ کی بو اللہ کو مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ معاذ بن جبلؓ نے فرمایا **سبحان اللّٰہ**

تعجب ہے لوگوں کے اس قول پر کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ نے مسواک کا جو حکم دیا ہے تو آپؐ خود جانتے تھے کہ مسواک سے روزہ دار کے منھ کی بو ختم نہیں ہوتی ہے (جو معدہ کے خالی ہونے سے پیدا ہوتی ہے) بلکہ مسواک تو دراصل منھ کی گندگی اور پیلے پن کو دور کرتی ہے جو خلوف سے الگ شئی ہے اور اس گندگی میں کوئی خیر نہیں ہے بلکہ وہ تو ایک بری چیز ہے۔(اخرجہ الطبرانی فی المعجم الکبیر ج ۲۰ ص ۷۰)

قائلین قول ثانی کے دلائل:

جو حضرات بعد الزوال مسواک کو مکروہ قرار دیتے ہیں ان کے مستدلات درج ذیل ہیں:

۱:- حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث: اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے روزہ دار کے منھ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے، **والذی نفسی بیدہ خلوف فم الصائم أطیب عنداللہ من ریح المسک.**

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ روزہ دار کے منھ کی بُو اللہ کے نزدیک مشک سے زیادہ پسندیدہ ہے اور مسواک چونکہ بُو کو ختم کر دیتی ہے اس لیے بعد الزوال مسواک کرنا مکروہ ہوگا۔

۲:- خباب بن الارت کی حدیث: **ان النبی ﷺ قال إذا صمتم فاستاکوا بالغداۃ ولاتستاکوا بالعشی فانه لیس من صائم تیبس شفتاہ بالعشی الا کانتا نوراً بین عینیه یوم القیامة** (بیہقی فی السنن الکبریٰ ج ۴ ص ۲۷۶) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم روزہ سے ہو تو صبح میں مسواک کرو اور شام کو مسواک نہ کرو اس لیے کہ شام کے وقت روزہ دار کے دونوں ہونٹ جو خشک ہو جاتے ہیں وہ قیامت کے دن اس کی آنکھوں کے درمیان چمکتے ہوں گے۔

مذکورہ حدیث میں شام کو یعنی بعد الزوال مسواک کرنے سے منع کیا گیا ہے، اس لیے مسواک مکروہ اور ناپسندیدہ ہوگی۔

۳:- اور دلیل عقلی یہ ہے کہ روزہ دار کے منھ کی بُو کو اطیب اور پاکیزہ قرار دیا گیا ہے، جو ایک اہم عبادت روزہ کا اثر اور علت ہے، اس لیے اس کو زائل کرنا مکروہ ہوگا جیسا کہ شہید کا خون جو اس کے جہاد کی علامت ہے، اس کا دھول زائل کرنا ممنوع ہے۔

قائلین قول اول کے دلائل کا جواب:

قول ثانی والوں نے قول اول والوں کے دلائل کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ جن احادیث میں عمومی طور پر بغیر کسی وقت کی تعیین کے مسواک کا حکم دیا گیا ہے وہ حدیثیں عام **لم یخص عنه شي**

نہیں ہیں بلکہ **عام خص عن البعض** ہیں، یعنی ان کا تعلق غیر روزہ دار سے ہے کہ وہ دن کے کسی حصہ میں مسواک کرسکتا ہے اس کے لیے کوئی کراہیت نہیں۔

قائلین قول ثانی کے دلائل کے جوابات:

قائلین قول اول نے دوسرے قول والوں کے متعدد جوابات دیئے ہیں:

۱:- قول ثانی والوں کا یہ کہنا کہ شام کے وقت مسواک کرنا اس لیے مکروہ ہے کہ وہ روزہ دار کے منھ کی بو ختم کردیتی ہے علامہ ابن تیمیہؒ نے چھ طریقہ سے اس کو رد کیا ہے:

(الف) کلی کرنا مسواک کے مقابلہ میں منھ کی بُو ختم کرنے میں زیادہ مؤثر ہے اور وہ بالاتفاق روزہ دار کے لیے ہر حال میں مشروع اور مسنون ہے، لہٰذا مسواک کرنا بھی ہر حال میں مسنون ہوگا۔

(ب) مسواک سے اللہ کا راضی ہونا روزہ دار کے منھ کی بو کو پسند کرنے سے بڑا ہے، اس لیے مسواک ہر حال میں مسنون ہوگی خواہ بو باقی رہے یا ختم ہوجائے۔

(ج) اللہ کا مسواک کو پسند کرنا صائم کے منھ کی موجود بُو کو پسند کرنے سے بڑھا ہوا ہے، اس لیے مسواک بغیر کسی وقت کی تعیین کے مستحب ہوگی۔

(د) مسواک جو کہ منھ کی بو کو ختم کردیتی ہے اس سے منھ کی بو کے پسندیدہ ہونے میں اللہ کے نزدیک قیامت کے دن کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔

(ہ) مسواک سے منھ کی بو ختم نہیں ہوتی ہے جیسا کہ قول ثانی والوں کا خیال ہے، کیونکہ بُو کا سبب معدہ کا کھانے سے خالی ہونا اور وہ مسواک کے بعد بھی موجود ہے۔

(و) اللہ کے نبی ﷺ نے روزہ کے مستحبات اور مکروہ کو بالتفصیل بیان کیا ہے، لیکن مسواک کو آپؐ نے مکروہات میں سے نہیں شمار کیا۔

۲:- خباب بن الارت رضی اللہ عنہ کی حدیث جو قائلین قول ثانی کا مستدل ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ضعیف ہے جیسا کہ اس کی تخریج میں اس کی وضاحت کی گئی ہے، اس کے بیان کرنے کی حاجت نہیں۔

۳:- قول ثانی والوں نے بعد الزوال مسواک کے مکروہ ہونے پر خون شہید سے استدلال کیا تھا، اس کا جواب یہ ہے کہ منھ کی بو کو خون شہید پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ عبادت کے اثر میں

اصل ہے اخفاء یعنی اس کو چھپانا اور شہید کے دم میں اصل ہے اس کا باقی رہنا تاکہ وہ خون قیامت کے دن مخالف پر شہید کے لیے حجت اور دلیل بنے، اس لیے بقاء دم شہید سے بقاء خلوف فم الصائم پر استدلال نہیں کیا جاسکتا، دوسرے یہ کہ شریعت نے خون شہید کو زائل نہ کرنے کی ہدایت دی ہے اور منھ کے بو کی بقاء کی کوئی ہدایت نہیں کی ہے، اس لیے خلوف فم الصائم کو دم شہید پر قیاس کرنا مناسب نہیں ہے۔

راجح قول یہی ہے کہ روزہ دار کے لیے ہر حالت میں مسواک کرنا جائز ہے چاہے زوال سے پہلے ہو یا زوال کے بعد، کیونکہ جن نصوص میں مسواک کی ترغیب دی گئی ہے وہ سب مطلق ہیں ان میں کسی وقت کی تخصیص نہیں کی گئی ہے۔

علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ سے صحیح طور پر یہ ثابت نہیں کہ آپ نے روزہ دار کو دن کے شروع اور آخر میں مسواک کرنے سے منع فرمایا ہے، بلکہ اس کے خلاف نقل کیا گیا ہے۔

ساتویں بحث
لوگوں کے سامنے مسواک کرنے کا حکم

فقہاء کرامؒ نے لوگوں کے سامنے مسواک کرنے کے بارے میں اختلاف کیا ہے، جمہور کا قول یہ ہے کہ مسواک کرنا ہر حالت میں خصوصاً نماز کے وقت مسجد میں اور لوگوں کے سامنے مسنون ہے، امام مالکؒ کا قول یہ ہے کہ مسجد میں اور لوگوں کے سامنے مسواک کرنا درست نہیں ہے۔

جمہور فقہاء کرام کے دلائل:

ا:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث، حضور ﷺ نے فرمایا **لولا أن أشق علي أمتي أو علی الناس لأمرتهم بالسواک مع کل صلوٰة**، یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مسواک ہر وقت اور خصوصاً نماز کے وقت مسنون ہے۔ فرض نمازیں مسجدوں کے اندر جماعت کے ساتھ ادا کی جاتی ہیں اس لیے مسواک کرنا مسجدوں میں اور لوگوں کے سامنے مسنون ہوگا۔ کیونکہ مومن کو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ عبادت کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لیے کامل اور لطافت کی حالت میں ہو، تاکہ اللہ کا قرب حاصل ہو۔

۲:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث: ابو بردہؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں ان کے والد فرماتے ہیں کہ میں اللہ کے نبی ﷺ کے پاس آیا، آپ ﷺ مسواک سے اپنے دانتوں کو رگڑ رہے

تھےاور اُع، اُع کی آواز نکل رہی تھی (مسواک کے رگڑنے کی آواز) اور مسواک آپ کے منھ میں تھی گویا کہ آپ تے کرر ہے ہوں، أتيت النبي ﷺ فوجدته يستن بسواک بيده يقول أُع، أُع والسواک في فيه كأنه يتهوع (بخاری ج اص ٦٦)

مذکورہ بالا حدیث تین چیزوں پر دلالت کرتی ہے ایک مسواک کی تاکید پر، دوسرے یہ کہ مسواک صرف دانتوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، کیونکہ اُع اُع کی آواز صرف دانتوں پر مسواک کرنے سے پیدا نہیں ہوتی ہے بلکہ دانت کے علاوہ منھ اور حلق کی صفائی کے وقت اس طرح کی آواز نکلتی ہے، تیسرے یہ کہ مسواک کرنا طہارت اور تنظیف کے قبیل سے ہے نہ کی گندگی اور بُو کے زائل کرنے کے باب سے، اسی لیے تو اللہ کے نبی ﷺ نے مسواک میں اخفاء نہیں کیا بلکہ عام لوگوں کے سامنے تعلیماً وترغیباً اس فعل حسن کا اظہار فرمایا

۳:-حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ تعالی عنہ کے بارے میں وارد ہے: كان يشهد الصلوات في المسجد وسواكه على اذنه موضع القلم من اذن الكاتب ولا يقوم الى الصلوٰة الا استن ثم رده الى موضعه (ترمذی ج اص ۳۴) حضرت زید بن خالد جہنیؓ مسجدوں میں نماز کے لیے آیا کرتے تھے درانحالیکہ مسواک ان کے کان پر ہوتی تھی جس جگہ کاتب اپنا قلم رکھتا ہے، جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو مسواک کرتے پھر اس کو اس کی جگہ پر لوٹا دیتے، زید بن خالد جہنیؓ کا مذکورہ عمل اس کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ لوگوں کے سامنے مسواک کرنا کوئی قبیح فعل نہیں ہے۔

امام مالکؒ کی دلیل:

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مسواک کا اصل مقصد ہے گندگی اور بدبُو کو ختم کرنا اور ایک شریف اور مہذب شخص کے لیے مناسب نہیں کہ وہ لوگوں کے سامنے گندگی کو صاف کرے، امام مالکؒ کا قول ابو ہریرہؓ کی حدیث کے خلاف ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مسواک میں اخفاء مناسب نہیں ہے اور نہ امام مصلیوں کے موجودگی میں مسواک کو ترک کرے گا کیونکہ مسواک بھی ایک قسم کی عبادت اور قرب الٰہی کا ذریعہ ہے۔

راجح یہی ہے کہ مسواک ہر حالت میں خصوصاً نماز کے وقت مسنون ہے اور فرض نمازیں چونکہ مسجدوں میں ادا کی جاتی ہے اس لیے لوگوں کے سامنے مسجدوں میں مسواک کرنا مستحب ہوگا۔ اللہ کے نبی ﷺ نے اس کا حکم بھی دیا ہے اور خود کر کے دکھلایا ہے اور اسے مخفی نہیں رکھا۔

(جاری ہے)

اسلامی کتب خانے

(بارہویں قسط)

از: دکتور علی بن علی ابو یوسف جہنی ترجمہ و تلخیص: مسعود احمد الاعظمی

چوتھی بحث
مسلمان خلفاء کے کتب خانے

تمہید:

یہ خلفاء، امراء اور حکمراں طبقہ کے کتب خانے ہیں، اسلامی تہذیب کے بعض تاریخ نویسوں نے اس کا یہ نام خلیفہ کی طرف نسبت کرکے رکھا ہے، یہ وہ کتب خانے ہیں جن کو وہ اپنے لیے قائم کرتے تھے، اور اس میں وہ بحث ومباحثہ اور مختلف علوم میں محاضرات کے حلقے قائم کیا کرتے تھے۔

اس قسم کے کتب خانے اسلامی قلم رو میں مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے تھے، خلفاء کے کتب خانوں کو عہد عباسی میں بہت فروغ حاصل ہوا، جو علم ومعرفت کے ساتھ ان کی دلچسپی کا نتیجہ تھا، جہاں تک کسی خلیفہ کے کتب خانے کی شہرت اور اس کی کتابوں کی تعداد کی کثرت وقلت کا سوال ہے، تو اس کا انحصار خلیفہ یا حاکم کے علمی ذوق ومقام اور کتابوں کے ساتھ دلچسپی اور شغف پر تھا۔

اسی لیے خلفاء کے کتب خانے نہایت نفیس اور قیمتی کتابوں پر مشتمل تھے۔ اور ان کے اندر متنوع فنون کی کتابیں ہوا کرتی تھیں، ان کتب خانوں میں ہر طرح کے لوگوں کے آنے کی اجازت ہوتی تھی، گو بعض کتب خانے صرف خلفاء یا حکام یا سربرآوردہ شخصیات ہی کے استعمال کے لیے مخصوص تھے، جس کی طرف مقدسی نے ''احسن التقاسیم'' میں یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ ''اس میں کوئی صاحب حیثیت ہی داخل ہوسکتا ہے''۔

اس طبقے کے علاوہ دوسروں کو اس میں آنے جانے کے لیے مخصوص اجازت کی ضرورت ہوتی تھی، جیسا کہ مشہور طبیب ابن سینا کے ساتھ پیش آیا، کہ اس کو اجازت لینے کے بعد ہی سامانیوں

کے کتب خانے میں جانے دیا گیا۔

تیسری صدی ہجری میں اسلامی حکومت کے متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوجانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے حکمرانوں نے علم وادب میں دلچسپی لی، اوراپنے درباروں میں علماء ادباءاور شعرا کو جمع کیا، علمی وثقافتی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی۔ جس سے اسلامی تمدن کو بھر پور فروغ حاصل ہوا۔ تمام اسلامی علاقوں میں علمی مراکز وجود پذیر ہوئے۔ اوراسلامی قلمرو کے مختلف حصوں میں خلفاء کے کتب خانے وجود میں آئے۔ خلفاء کے مشہور کتب خانے حسب ذیل ہیں:

بغداد کے عباسی خلفاء کا کتب خانہ:

بغداد کا بیت الحکمت عالم اسلام کا مشہوراوراہم ترین کتب خانہ سمجھا جاتا ہے۔ غالباً وہ سب سے پہلا کتب خانہ ہے جو عباسی دور میں قائم ہوا، جیسا کہ متعدد تاریخی مراجع اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

کتب خانۂ بیت الحکمت قرآن کریم کے بیش قیمت نسخوں اور مختلف علوم وفنون سے متعلق کتابوں کی وجہ سے بڑا عظیم تھا، عالم اسلام کے مشہور کتب خانوں پر گفتگو کرتے ہوئے قلقشندی نے اس کی نسبت لکھا ہے:

''پہلے کے خلفاءاور بادشاہوں کو اس کا حد درجہ اہتمام اور خیال تھا، حتی کہ انھوں نے بڑی تعداد میں کتابیں بہم پہنچائیں، اور عظیم الشان کتب خانے قائم کیے، کہا جاتا ہے کہ عہد اسلامی میں عظیم ترین کتب خانے تین تھے۔

سب سے پہلا کتب خانہ عباسی خلفاء کا تھا، اس کی کتابوں کی تعداد حد شمار سے باہر تھیں، اور اس کی بہترین کتابوں کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا، یہ کتب خانہ اسی طرح اپنی شان وشوکت کے ساتھ باقی رہا، تا آنکہ بغداد پر تاتاریوں کا حملہ ہوا، اور ہلاکو نے بغداد کے آخری خلیفہ مستعصم کو تہِ تیغ کردیا، اس حملے میں وہاں کی جو چیزیں برباد ہوئیں، ان میں یہ کتب خانہ بھی تھا، جس کے آثار اور نشانات تک ختم ہوگئے''۔ (۱)

جہاں تک کتب خانۂ بیت الحکمت کے نام کا تعلق ہے، تو اس کے مختلف نام کتابوں میں ملتے ہیں، کبھی اس کے لیے ''بیت الحکمت'' کا لفظ استعمال کرتے تھے، جیسا کہ ابن الندیم اور قفطی وغیرہ

(۱) صبح الأعشی: ۱/ ۴۶۶-۴۶۷

نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے، اور کبھی اس کے لیے ''خزانۃ الحکمت'' کا لفظ بولتے تھے، جیسا کہ یاقوت حموی نے کیا ہے، مگر یہ سب ایک ہی کتب خانے کے کئی نام تھے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تاریخ کے ابتدائی مصادر یہ بتاتے ہیں کہ جو لوگ بیت الحکمت سے منسلک تھے، ان ہی کا نام خزانۃ الحکمت میں بھی پایا جاتا ہے، مثال کے طور پر ابن الندیم نے سہل بن ہارون پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''وہ مامون کا خدمت گزار اور خزانۃ الحکمت کا نگراں تھا''۔

اور سعید بن ہارون پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''بیت الحکمت میں سہل بن ہارون کا شریکِ کار تھا''۔

ان دونوں روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سہل بن ہارون اور سعید بن ہارون ایک ہی جگہ سے وابستہ تھے، شریک کا لفظ یہ بتلا رہا ہے کہ دونوں ایک ہی کتب خانے میں اور شریک کار تھے۔

ابن الندیم کے ایک جگہ ''خزانہ'' اور دوسری جگہ ''بیت'' کا لفظ استعمال کرنے کا سبب یہ ہے کہ دونوں لفظ مترادف کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، اور دونوں تعبیریں بغیر کسی فرق کے مستعمل تھیں۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ ''بیت الحکمت'' خلافت عباسیہ کے محلات میں کتابوں کے لیے مخصوص ایک مقام تھا، اس کی تائید معجم الادباء کی ایک عبارت سے بھی ہوتی ہے، جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے، کہ وہ متعدد کمروں اور حجروں پر مشتمل تھا، اس میں متعدد ورّاق رہتے تھے، جو اتنی بڑی تعداد کو املا کرایا کرتے تھے کہ ان کو شمار کرنا ممکن نہیں تھا، یاقوت نے لکھا ہے کہ: ''ابو بریدہ وضّاحی کا بیان ہے کہ امیر المومنین مامون نے فرّاء کو نحو کے اصول اور اس کے بارے میں عربوں سے جو سنا ہے اس کو جمع کرنے کا حکم دیا، جس کے لیے اس نے محل کے ایک کمرے کو خاص کردینے کا فرمان جاری کیا، اس کے لیے ورّاق مہیا کیے، امانت دار اور تعلیم یافتہ لوگوں کو اس کے ساتھ لگایا، چنانچہ ورّاق اس کے پاس لکھا کرتے تھے حتی کہ اس نے ''حدود'' پر کتاب تصنیف کی، اور مامون نے اپنی کتابوں کو خزانوں میں رکھنے کا حکم جاری کیا، اور اس نے قرآن کریم کی تفسیر میں کتاب المعانی املا کرانا شروع کیا، ابو بریدہ کا بیان ہے کہ ہم نے کتاب المعانی لکھنے کے لیے جمع ہونے والے افراد کو شمار کرنے کا ارادہ کیا، تو ہم کر نہیں سکے۔

مختلف تاریخی بیانات سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ''بیت الحکمت'' ایک بڑی عمارت تھی، جس میں متعدد ہال اور کشادہ کمرے تھے، جو اس عمارت کے مختلف حصوں میں منقسم تھے، جس میں متعدد کمرے کتابوں کے واسطے مخصوص تھے، اور ہر حصے میں مخصوص علمی کتابوں کا ایک کلیکشن تھا، جو اس

کے مؤسس کی طرف منسوب تھا، جیسے خزانۃ الرشید (رشید کلیکشن)، اور خزانۃ المامون (مامون کلیکشن)

''بیت الحکمت'' کے ذکر کے ساتھ منصور، رشید، برامکہ، امین، مامون، اور متوکل جیسے متعدد ارکان دولت کا نام بھی آتا ہے، اسی طرح اس کے ساتھ کئی ایک عالم، نگراں اور ملازم کا نام بھی متعلق ہے، جن میں سے کچھ کا نام اس بحث میں انشاء اللہ آئے گا۔

اس کتب خانے کے بانی ومؤسس کے سلسلے میں عصر حاضر کے مصنفین مختلف الرائے ہیں، بیشتر کا خیال یہ ہے کہ اس عظیم الشان ادارے کی بنیاد نہاد کرنے والا مشہور عباسی خلیفہ ہارون رشید (۱۴۹ھ=۱۹۳ھ) تھا بعض دوسرے حضرات کا خیال یہ ہے کہ اس کا سہرا ہارون کے نور نظر مامون -۱۹۸=۲۱۸- کے سر ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کتب خانے کا تذکرہ دوسرے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور -۱۳۵=۱۵۸ھ- کے زمانے ہی سے آتا ہے، جو عباسی حکومت کے قیام کے پانچ سال بعد ہی بر سر اقتدار آ گیا تھا، چنانچہ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ: ''میں نے منصور کے کتب خانے میں دیکھا ہے کہ اس نے مدینۃ السلام، اس کی جامع مسجد، قصر الذہب اور بازاروں کی تعمیر میں خرچ کیا تھا(۱)''۔

ابن کثیر کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ منصور کے عہد میں تصنیف وترجمہ ہونے والی کتابوں کے لیے ایک لائبریری موجود تھی، مگر ہارون رشید سے پہلے اس کے لیے ''بیت الحکمت'' یا ''خزانۃ الحکمت'' کا لفظ نہیں استعمال کیا گیا، کیونکہ ہارون کے عہد میں تالیف وترجمہ کی سرگرمی زیادہ منظّم طریقے سے آگے بڑھی۔

منصور کو ترجمہ وتالیف کے کام سے بہت دلچسپی تھی، ''اور فقہ میں تو اس کو کمال حاصل تھا''(۲)

ابن خلدون نے لکھا ہے کہ: ''منصور نے شاہ روم کو یہ خط لکھا کہ اس کے پاس متقدمین کی کتابیں ترجمہ کرا کے بھیجے(۳)''۔

وہ پہلا خلیفہ تھا جس کے واسطے -جس کے حکم سے- دوسری زبان کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا، منجملہ ان کے ''کلیلہ ودمنہ''، ''کتاب السند ہند'' تھی، ان کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں تھیں جو یونانی، رومی، فارسی اور سریانی زبانوں سے عربی میں منتقل کی گئیں(۴)۔

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ/۱۰: ۹۸، اخبار الحکماء: ۲۱۳، عیون الابناء ۳: ۲۳۲، ۲۳۴

(۲) کشف الظنون ۱: ۳۶ (۳) مقدمہ ابن خلدون: ۴۰۱

(۴) شذرات الذہب ۸: ۲۹۱

منصور کی توجہ کسی ایک علم پر منحصر نہیں تھی، بلکہ جدید علوم جیسے مذہبی علوم اور علم طب کی تمام قسموں کو بھی اس نے شامل کر رکھا تھا، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے منصور کی علم وفقہ سے متعلق کچھ گفتگو ہوئی، اس گفتگو کے بعد منصور نے امام مالک سے فرمائش کی کہ فقہ کی تدوین کردیں اور اس پر ایک کتاب تصنیف کردیں۔ منصور نے ان کو اس طرز تصنیف کی طرف رہنمائی کی جس کی وجہ سے کتاب آسانی سے لوگوں کی سمجھ میں آسکے، منصور نے کہا تھا: ''درمیانی امور پر اپنی نگاہ رکھیں، اور ان مسائل کو جمع کرو جن پر ائمہ اور صحابہ رضوان اللہ علیہم کا اتفاق ہے۔ ہم انشاءاللہ آپ کے علم اور آپ کی کتاب پر عمل کرنے کے لیے- اور اسلامی قلمرو میں اس کو پھیلانے کے لیے لوگوں کو مجبور کریں گے- لوگوں کو یہ تاکید کی جائے گی کہ اس کی مخالفت نہ کریں اور اس کے سوا کسی پر عمل نہ کریں''۔

امام مالک علیہ الرحمہ نے منصور کے اس فرمان پر عمل کرتے ہوئے اپنی مشہور کتاب ''موطا'' تصنیف فرمائی۔ مذکورہ بالا سرگرمیوں کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتب خانہ- بیت الحکمت- ابوجعفر منصور کے عہد خلافت میں منصۂ شہود پر آیا تھا، اور وہ طب وہندسہ کی ان کتابوں کی وجہ سے تھا، جو اس کے حکم سے ترجمہ کی گئی تھیں، اور ان تصانیف کی بدولت تھا جو حدیث وتاریخ وادب پر تالیف ہوئی تھیں۔

احتمال یہی ہے کہ اس کا قائم کرنے والا، یا کم از کم اس کا خاکہ بنانے والا منصور ہی ہو، اور عصر حاضر کے بعض مؤرخین کا جو یہ خیال ہے کہ اس کا مؤسس ہارون رشید تھا، تو غالبًا اس کا سبب یہ ہے کہ اس سے پہلے اس کتب خانے کا ذکر نہیں ہوا، اور اس پر استدلال ابن الندیم کی اس عبارت سے کرتے ہیں، جو اس نے ابوسہل فضل بن نوبخت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''وہ ہارون کے خزانۃ الحکمت میں مقرر تھا، اور اس کے واسطے اس نے عربی زبان میں فارسی کتابوں کا ترجمہ کیا''۔

اسی طرح علان شعوبی کے تذکرے میں لکھا ہے کہ: ''وہ بیت الحکمت میں رشید ومامون اور برامکہ کے لیے نسخہ نویسی کرتا تھا۔''

اور یہ بات درست ہے کہ منصور کے عہد میں ''بیت الحکمت'' کا ذکر نہیں ملتا، مگر واقعہ یہ ہے کہ ''خزائن'' کے نام سے یہ لفظ ملتا ہے۔

اور بعض دوسرے مصنفین کا جو یہ خیال ہے کہ اس کا بانی مامون ہے، تو غالبًا اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض تاریخی مراجع میں اس کو ''خزانۃ المامون'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

منصور نے اپنے صاحبزادے مہدی کو اس خزانے کے متعلق تاکید کی تھی، مگر اس نے اس

سے لاپروائی برتی، پھر جب ہارون رشید مسند خلافت پر بیٹھا، تو اس نے اپنے پیش رو منصور کے کلیکشن میں قدیم کتب خانوں کی بہت سی کتابوں کا اضافہ کیا، اسی طرح اس میں ایسی بہت سی کتابیں شامل کیں جو مسلمانوں کے مختلف مفتوحہ ممالک سے جمع کی گئی تھیں، ابن ابی اصیبعہ کے قول کے مطابق ''انقرہ، عموریہ اور روم کے باقی علاقوں کو جب مسلمانوں نے اپنے قبضے میں لیا، تو وہاں جو کتابیں دستیاب ہوئیں، وہ اس کتب خانے میں منتقل کی گئیں''۔ (۱)

راجح قول کے مطابق یہ ۱۹۰ھ = ۸۰۵ء میں پیش آیا، اس کے بعد کتب خانے کو بہت وسعت حاصل ہوئی، اور متعدد خزانوں کا مجموعہ بنا، ہر خزانے -کلیکشن- کا ایک نگراں تھا، یہاں تک کہ عہد عباسی کا سب سے بڑا کتب خانہ بن گیا، اس وجہ سے تاریخ کی کتابوں اور ابتدائی آخذ میں یہ کتب خانہ اس کے نام کے ساتھ مربوط و مقرون ہے۔

ہارون کے دور میں دوسری زبانوں جیسے یونانی، فارسی، ہندی اور قبطی سے عربی میں نقل و ترجمہ کا دور دورہ ہوا، اور رشید نے ترجمہ کے کام کے لیے متعدد مترجمین کا کتب خانے میں تقرر کیا، اس کتب خانے میں عربی زبان میں کتابوں اور قلمی نسخوں کے ترجمہ کے لئے اہل علم وتحقیق اور مشہور ترجمہ نگاروں کی ایک ٹیم تھی۔

ہارون رشید کے عہد میں خزانۃ الحکمت صرف کتابوں کا ذخیرہ نہیں تھا، بلکہ ترجمہ وتعریب کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع ترین معنی میں ثقافت کا بھی ایک مرکز تھا، اہل علم کا نشیمن اور درس ومطالعہ کرنے والوں کے لیے بحث وتحقیق کا سینٹر تھا، بیت الحکمت کے اس کتب خانے میں مترجمین کے لیے متعدد کمرے بنوائے گئے تھے، ترجمہ پر نظر ثانی کرنے والوں کے لیے الگ کمرے تھے، اور نسخہ نویسوں کے لیے علیحدہ کمرے تھے جو اپنے لیے یا دوسروں کے لیے نسخہ نویسی کیا کرتے تھے، ان جلد سازوں کے لیے الگ کمرے تھے، جو کتب خانے کی کتابوں کی جلد سازی کیا کرتے تھے، اسی طرح وراقوں اور کتابیں لین دین کرنے والے ان لوگوں کے لیے الگ کمرے تھے، جو مطالعہ کرنے والوں، نسخہ نویسوں اور جلد سازوں کو کتابیں لاکر دیا کرتے تھے۔

لیکن بیت الحکمت کی حقیقی ترقی ہارون رشید کے جانشین خلیفہ مامون (۱۹۸-۲۱۸ھ = ۸۱۳-۸۳۳ء) کے عہد میں ہوئی، مامون اپنے وفور علم، وسعت مطالعہ، علم دوستی اور معارف پروری میں شہرۂ آفاق تھا اور شعر و ادب، حدیث وطب اور دیگر علوم وفنون میں اپنے والد پر فائق تھا۔ مزید برآں وہ کچھ کتابوں اور رسالوں کا مصنف بھی تھا۔ (۲)

---

(۱) عیون الانباء: ۱/۱۷۵ (۲) الفہرست: ۱۰۵

اس نے اپنے دادا منصور کے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا، تحصیل علم پر توجہ دی، اور علم ومعرفت کے جواہر پاروں کوان کے خزانوں سے برآمد کیا۔ [(۱)]

قدیم کتابوں کے درس ومطالعہ میں کوشش صرف کی، گہرائی اور باریک بینی سے ان کا مطالعہ کرتے کرتے ان کا ماہر ہوگیا [(۲)]۔

یہی وجہ تھی کہ مامون نے کتب خانۂ ''بیت الحکمت'' پر خصوصی توجہ صرف کی، اس کی فکر اور نگہداشت کی، اس کے لیے بہت ساری کتابیں اور بڑے بڑے مجموعے بہم پہنچائے، اس دور کے مشہور علماء ومترجمین میں سے بڑی تعداد کو اس سے وابستہ کیا، بیت الحکمت کے ذخیرے میں خوب توسیع کی، فراہمیٔ کتب کے لیے عالم اسلام اور ملک روم کی مختلف سمتوں میں وفود بھیجے، جس کا ترجمہ وتعریب کی تحریک اور سر گرمی کو تیز رفتار بنانے اور قدیم علمی سرمائے کو ان کے دفینوں سے نکال کر جمع کرنے میں غیر معمولی اثر ہوا۔

اس کا ایک فطری نتیجہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں میں علم وثقافت کو فروغ حاصل ہوا، اور دوسرے علوم نے ان کے درمیان جگہ بنانا شروع کیا، دوسرے علوم وفنون کو اپنے آغوش میں لینے کی وجہ سے اس سرمائے کے تحفظ اور فروغ کے اسباب پیدا ہوگئے، اور مزید ترقی یافتہ صورت میں اگلی نسلوں تک بحفاظت منتقل ہوگئے، اگر یہ اسباب نہ پیدا ہوئے ہوتے تو قریب تھا کہ وہ قدیم سرمایہ ضائع ہوجاتا۔

اس طرح مامون کے عہد میں کتابوں کی فراہمی اور ان کے نظم وانتظام کا کام بہت نمایاں شکل میں ظہور پذیر ہوا، چنانچہ وہ یا تو مفتوحہ علاقے کے حاکم سے مصالحت کرتا، جیسا کہ جزیرۂ قبرص کے حاکم کے ساتھ ہوا، اور کسی کو وہاں کی کتابوں کے ذخیرے کو طلب کرنے کے لیے بھیج دیتا، یا حکام سے مراسلت کے بعد مختلف علاقوں میں کتابوں کی فراہمی، یا ان کا ترجمہ اور ان سے استفادہ کے لیے وفود بھیج دیتا، جیسا کہ شاہ روم کے ساتھ مامون کی خط وکتابت کے بعد ہوا، جو کچھ پس وپیش کے بعد وہاں کی کتابیں دینے کے لیے آمادہ ہوگیا، حنین بن اسحاق نے اس کام کے لیے بہت سے علاقوں کا سفر کیا، اور مطلوبہ کتابوں کی تحصیل کے لیے دور دراز تک پہنچ گیا۔

ان سرگرمیوں کی وجہ سے مامون کا عہد خلافت بیت الحکمت کا سب سے پُر شوکت دور تھا، یہاں تک کہ بحث وتحقیق، تصنیف وتالیف، اور دوسری زبانوں کی کتابوں کے ترجمہ وتعریب کے لحاظ سے اس کا زمانہ عہد زریں سمجھا جاتا ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے زمانے میں ترجمہ کا کام ایک سرکاری عمل بن چکا تھا، اس کام کے

---

(۱) طبقات الامم، لصاعد الاندلسی: ۱۰۱ (۲) مروج الذہب: ۳۰۰/۸

لیے حکومت کا بجٹ مخصوص ہوتا تھا، اس کے لیے بلند پایہ اہل علم ودانش اور مترجمین کو جمع کیا جاتا تھا۔ علمی، ادبی اور طبی کتابوں کے لیے صعوبتِ سفر برداشت کی جاتی تھی، اور اس کے واسطے بادشاہوں اور حکمرانوں سے خط وکتابت کی جاتی تھی۔

مامون کتب خانے کے لیے بہت فراخ دل تھا۔ مؤرخوں، نحویوں، حدیث جمع کرنے والوں، ترجمہ نگاروں، نسخہ نویسوں، اور ان کے علاوہ کتب خانے میں کام کرنے والے دوسرے لوگوں پر دل کھول کر خرچ کیا کرتا تھا، کتب خانے کے دوسرے اخراجات اس پر مستزاد تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ نگاروں کا حق الخدمت ان کے ترجمہ کی قدر وقیمت کے لحاظ سے ادا کیا جاتا تھا، چنانچہ کتابوں میں مذکور ہے کہ مشہور مترجم حنین بن اسحاق عربی میں جو ترجمہ کرتا، اس کتاب کے وزن کے برابر اُس کو سونا دیا جاتا تھا۔

بیت الحکمت کا میدان اتنا وسیع تھا کہ اس کی توجہ صرف کتابوں کی فراہمی اور ذخیرہ اندوزی پر نہیں تھی، بلکہ تصنیف وتالیف، جدت طرازی اور علم وفن کے اضافہ کے لیے بھی اس کی کوشش تھی، بلکہ یہ ایک ایسی عظیم الشان مہم تھی، جس کو اس کتب خانے نے انجام دیا اور اس کی حوصلہ افزائی کی، چنانچہ بیشتر وہ لوگ جو اس کتب خانے سے مربوط تھے، خواہ انتظامی حیثیت سے رہے ہوں یا ترجمہ کے کام کے لیے، ان موضوعات پر انھوں نے کتابیں تصنیف کیں، جن کے وہ ماہر تھے، مثال کے طور پر فرّاء جس کا نام یحیی بن زیاد بن عبداللہ منصور- متوفی ۲۰۷ھ =۸۲۲ء- تھا، اور فن نحو کا مشہور عالم تھا، بیت الحکمت میں موجود کتابوں کی مدد سے ہی نحو پر اس نے اپنی مشہور کتاب ''الحدود'' تصنیف کی۔ اس کتاب کی تصنیف مامون ہی کی فرمائش اور اس کی دلچسپی کے بعد عمل میں آئی تھی۔

قفطی نے لکھا ہے کہ محمد بن موسی خوارزمی متوفی ۲۲۰ھ مامون کے اس کتب خانے میں عزلت گزیں تھا، اس نے بیت الحکمت ہی میں بیٹھ کر الجبرا والمقابلہ کا فن ایجاد کیا تھا، یہ علم ریاضی کا نہایت اہم فن ہے، اور یورپ نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا ہے، اور خوارزمی کی کتاب کا کئی زبانوں میں ترجمہ کیا ہے، اسی طرح علم ہندسہ کے ماہر موسی بن شاکر کے لڑکوں محمد، احمد اور حسن نے مامون کے کہنے پر محیط ارضی کی پیمائش کی، یہ کام ان بھائیوں نے صحراء سنجار کے نصف دائرے کی پیمائش کے ذریعے کیا تھا، ان کا اندازہ اس کے حقیقی طول سے بہت ملتا جلتا تھا۔

اسی طرح لغت کے مشہور عالم وامام اصمعی نے شاہان گزشتہ کی تاریخ پر ایک کتاب تصنیف

کی تھی، بیت الحکمت ہی میں رہ کر ابن الندیم نے اپنی مشہور کتاب ''الفہرست'' اور مشہور مورخ مسعودی نے ''مروج الذہب'' تالیف کی تھی، اسی طرح عیسی بن علی طبیب نے بھی طب وحکمت پر کتابیں ترتیب دی تھیں۔

مامون کے احوال اور سابقہ بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو تعریب وترجمہ کے کام کے ساتھ اصلی تصنیف کا بھی بہت زیادہ اہتمام تھا، اس کا دور ایسے بڑے بڑے اہل علم سے معمور تھا جنھوں نے مختلف علوم پر کتابیں تصنیف کیں، اور اس نے اور اس کے بعد آنے والے خلفاء نے اس کتب خانے میں مختلف علوم وفنون کا بہت بڑا سرمایہ اور ذخیرہ جمع کر دیا۔

بیت الحکمت بڑے بڑے کمروں، ہالوں اور حجروں میں تقسیم تھا، اس کا زیادہ حصہ کتب خانے کے لیے مخصوص تھا، اس میں درس گاہیں بھی تھیں، لیکچرز اور محاضروں کے لیے ہال بھی بنے ہوئے تھے، علمی مباحثوں اور مناقشوں کے لیے الگ کمرے تھے، جس میں پوری آزادی کے ساتھ مختلف موضوعات پر علمی مباحثے اور مذاکرے ہوتے، دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کتب خانے میں استراحت کے واسطے بھی ایک مخصوص کمرہ تھا، جس میں بحث وتحقیق، درس ومطالعہ اور دوسرے کاموں میں مصروف افراد اپنی تکان دور کرنے کے لیے آرام کرتے۔

کتب خانے کے ذمہ داروں نے اس کی کتابوں کو مختلف الماریوں اور خانوں میں ترتیب کا اہتمام کیا تھا، اور غالب گمان یہ ہے کہ یہ کتابیں زبان کی رعایت کرنے کے بعد موضوعات کی ترتیب سے رکھی گئی تھیں، تاکہ مطالعہ اور استفادہ کرنے والوں کے لیے سہولت رہے۔

کئی جلدوں میں اس کتب خانے کی فہرستیں تھیں، جن سے کتب بینوں کو کتابوں کی دریافت میں مدد ملتی تھی۔

یہ فہرستیں دو قسموں کی تھیں۔ ایک تو وہ جو کتابوں کی شکل میں مجلد تھیں، اور دوسرے وہ جو ہر قسم کے دروازے پر تختیوں کی صورت میں آویزاں تھیں۔

کتب خانے کا دروازہ درس ومطالعہ اور تحقیق کے شیدائیوں کے لیے ہمہ وقت کھلا رہتا تھا، اور ہر پڑھنے والا کتاب کو کتب خانے کے اندر پڑھنے کے لیے یا کچھ شرائط کے ساتھ باہر لے جانے کے لیے کتاب کو عاریت پر لے جا سکتا تھا۔

(جاری ہے)

اہل علم کے خطوط بنام حضرت محدث کبیرؒ

(مکاتیب حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

ترتیب: مسعود احمد الاعظمی

باسمہ تعالیٰ

حضرت مخدومی محترمی! دامت فیوضکم

سلام مسنون۔

خدا کرے مزاج گرامی اب بالکل بعافیت ہو، گرمی کی شدت کی وجہ سے اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ مجلس شوریٰ میں شرکت کا خود اپنے اندر قوی داعیہ نہیں ہے، ابھی تک دیوبند کے سفر کا فیصلہ نہیں کر سکا، بس اس کی لالچ ہے کہ اس بہانہ ہم سب جمع ہو جاتے ہیں اور مختلف موضوعات پر تبادلہ خیالات کا موقع مل جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے بھی مجھ سے فرمایا تھا کہ اگر تم چلو گے تو میں بھی چلوں گا ورنہ نہیں۔

مولانا علی میاں رائے بریلی چلے گئے ہیں، غالباً وہ نہیں جائیں گے۔

''علماء دیوبند کا مسلک'' کے بارے میں جناب والا کی رائے کا انتظار ہے، میرے نزدیک لکھنا ضروری ہے اور زیادہ بہتر یہی ہے کہ اصلاً آپ تحریر فرمائیں، پھر میں بھی اس پر لکھوں اور اگر ڈاکٹر صاحب کے پاس بھی آیا ہو تو ان کو بھی شریک کر لیا جائے، یقیناً ان کا احساس بھی وہی ہوگا جو ہم لوگوں کا ہے۔

ایک مسئلہ دریافت طلب یہ ہے کہ زمینداری وغیرہ کے جو بانڈ ملتے ہیں، ان کو اگر نقد فروخت کیا جائے تو بڑے فرق کے ساتھ فروخت ہوتے ہیں، اور اگر رکھا جائے تو ایک طویل مدت تک گویا بے کار ہیں، کیا فرق کے ساتھ یہ بیع جائز ہے؟

اسی سے ملتی جلتی ایک صورت یہ ہے کہ، کاروبار کے سلسلے میں بعض دوکانداروں کا طریقہ یہ

ہے کہ ان کو جو مال دیا جاتا ہے وہ اس کی قیمت کا چک مثلاً دو ہفتہ بعد کی تاریخ کا کاٹ دیتے ہیں، ایسے چکوں کو اگر کیش کرایا جائے تو کچھ فرق کے ساتھ کیش ہوتے ہیں، کیا اس کے جواز کی گنجائش ہے؟ صرف اثبات ونفی میں کارڈ پر جواب کافی ہے۔

برادرم مولوی رشید احمد صاحب کو سلام مسنون

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

محمد منظور نعمانی

....

محمد منظور نعمانی

رئیس تحریر مجلۃ الفرقان لکھنؤ

حضرت معظمی محترمی دامت فیوضکم وبرکاتکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے میں ۱۳/اپریل کو بعافیت لکھنؤ واپس آ گیا تھا۔ برابر ارادہ کرتا رہا کہ عریضہ لکھوں لیکن ابھی تک نوبت نہیں آئی، کل سرورصبّان صاحب کا خط آیا ہے جس کے ساتھ ایک دوسرا خط جناب کے لیے بھی تھا وہ بھی حاضر خدمت کررہا ہوں۔

ذی الحجہ کے آخری عشرہ میں مدینہ طیبہ پہنچ کر مولوی اقبال اعظمی سے ملاقات ہوئی، تو انھوں نے گرامی نامہ دکھایا، وہاں سے مکہ معظّمہ واپس آ کر میں عبدالشکور فدا صاحب سے ملا، ان کو بھی گرامی نامہ مل چکا تھا، بہرحال ان سے تین تین نسخے دونوں کتابوں کے لے لیے، مجھے یاد تھا کہ ایک ایک نسخہ خود شیخ سرورصبّان کے لیے اور ایک ایک مفتی اکبر کے لیے آپ نے فرمایا تھا۔ تیسرے کے بارے میں مجھے یاد نہیں رہا، فدا صاحب بھی نہیں بتا سکے، ان کے پاس گرامی نامہ محفوظ نہیں تھا، اس لیے شیخ سرور صبّان اور مفتی اکبر کے نسخے تو آپ کی طرف سے اہداءً لکھ کر سرورصبّان صاحب کے حوالہ میں نے خود کر دیئے تھے۔ باقی ایک ایک نسخہ میں مدرسہ صولتیہ میں بطور امانت محفوظ کر آیا ہوں، میری رائے یہ ہے کہ اگر کسی اور کو اس وقت پہنچانا ضروری نہ ہوتو پھر وہ دونوں نسخے صولتیہ کے کتب خانہ ہی کے لیے دے دیئے جائیں، اگر رائے ہوتو آپ براہ راست تحریر فرمادیں اور مجھے بھی مطلع فرمادیں میں بھی لکھ دوں گا، اور اگر مکہ معظّمہ میں کسی اور کو پہنچانے ضروری ہوں تو مجھے تحریر فرمادیں میں لکھ دوں گا اور مولانا

سلیم صاحب کے صاحب زادے مولوی محمد شمیم خود پہنچا آئیں گے۔ میں یہ بات کر آیا ہوں۔
دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا دعوت نامہ مجھے آج ملا ہے، جناب کی خدمت میں بھی پہنچ گیا ہوگا، موسم تو سخت ہوگا، لیکن تشریف لے چلیں تو اچھا ہے۔ دہرہ سے سفراچھا رہے گا ایک دن پہلے سہارن پوراتر جائیں گے۔
خدا کرے مزاج گرامی بخیر وعافیت ہو، میں انشاءاللہ ۳ر مئی سے ۹ر مئی تک سنبھل اور دہلی (نظام الدین) حضرت شیخ کی خدمت میں رہوں گا۔ ۱۰ر کو واپسی کی امید ہے، والسلام
محمد منظور نعمانی

....

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ - ۲۵ر جولائی ۶۷ء

مخدومی معظمی! دامت فیوضکم وبرکاتکم
سلام مسنون

پرسوں گرامی نامہ نے مشرف فرمایا۔
مجھے یہ اندازہ بالکل نہ تھا کہ کتاب الزہد پر تبصرہ کا کہیں انتظار ہوگا، اس کے باوجود جس دن کتاب موصول ہوئی تھی اسی دن سے برابر میرے سامنے اسی چوکی پر رکھی ہوئی ہے جس پر بیٹھ کر میں لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہوں، ذاتی استفادہ کے لیے تو نیت یہ تھی کہ جب بھی اطمینان کا موقع ملے گا اس کا مطالعہ کروں گا، اسی لیے نہ الماری میں رکھی نہ جلد ساز کو دی۔
لیکن جلدی جلدی نزلہ بخار میں مبتلا ہونے کے علاوہ وقت میں اتنی بے برکتی کا تجربہ ہو رہا ہے کہ عذر کرتا ہوں تو زندگی بالکل لا حاصل اور بے مصرف نظر آتی ہے۔
مہینوں سے یہ چکر ہے کہ مہینہ میں ۸-۱۰ دن طبیعت علیل، پھر قریباً اتنے ہی دن استراحت کی نذر اور باقی ۸-۱۰ دنوں میں الفرقان وغیرہ کا کام- کیونکہ مولوی عتیق الرحمٰن جنھوں نے ۱۰-۱۲ سال سے الفرقان کی ترتیب اور تیاری کے کام سے مجھے بالکل سبکدوش کر دیا تھا، قریباً ۲-۳ سال سے کبھی کبھی بس ''نگاہ اولیں'' کے ۳-۴ صفحے لکھ دیتے ہیں، باقی کام ترتیب اور تیاری کا مجھے خود ہی انجام دینا پڑ رہا ہے۔ ان کی صحت مجھ سے بہت زیادہ گئی گزری ہے۔

الغرض ان حالات کا نتیجہ ہے کہ میں کتاب الزہد کا مطالعہ بھی نہیں کر سکا۔لیکن اب نیت کی ہے کہ انشاء اللہ اس کا مطالعہ شروع کروں گا اور کوشش کروں گا کہ مہینہ کے اندر اندر لکھ سکوں، اگر اللہ تعالیٰ نے اس میں کامیاب فرمایا تو ستمبر کے شمارہ میں آسکے گا۔

یہ معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی کہ مصنف عبدالرزاق کا کام قریب تکمیل کے ہے۔

....

مجھے بالکل معلوم نہیں کہ فقہی انسائکلو پیڈیا کی تدوین میں ہندوستانی علماء میں سے کوئی صاحب حصہ لے رہے ہیں یا نہیں۔میری رائے ہے کہ اگر وہاں سے تقاضا ہے تو جناب ضرور حصہ لیں بلکہ اصرار کے ساتھ رائے ہے، لکھنؤ تشریف آوری کے لیے ضرور وقت نکالیئے۔اگر میرا حال وہ نہ ہوتا جو اوپر عرض کیا تو میں خود مئو حاضر ہوتا، بہت ہی دن ہو گئے ہیں، دعا کا محتاج وطالب ہوں اور اپنی سعادت سمجھ کر دعا کرتا ہوں، والسلام۔

محمد منظور نعمانی

برادر عزیز ومکرم مولوی رشید احمد صاحب سلام قبول کریں

....

باسمہ سبحانہ

۲۲؍مئی

حضرت معظمی محترمی! دامت فیوضکم

سلام مسنون

والا نامہ ابھی ابھی ملا، میں آج ہی سنبھل روانہ ہو رہا ہوں، مولانا علی میاں رائے بریلی ہیں غالب گمان یہ ہے کہ ان کا ارادہ اس وقت سفر دیوبند کا نہیں ہے، جب وہ رائے بریلی گئے تھے تو تذبذب تھا پھر کچھ نہیں معلوم ہو سکا، موسم کی انتہائی شدت کی وجہ سے غالب گمان یہی ہے کہ وہ سفر نہیں کریں گے۔

مجھے سنبھل سے دہلی اور سہارنپور بھی جانا ہے، لیکن دیوبند کے بارے میں ابھی تک ذہن صاف نہیں ہے، غالباً سہارنپور پہنچ کر طے کر سکوں گا، طبیعت بہت ہی برداشتہ ہے، سخت ذہنی الجھن ہے، جو عرصہ سے چل رہی ہے، اللہ تعالیٰ رہنمائی فرمائے، اگر طبیعت آمادہ ہو تو ضرور تشریف لے جائیں۔دعا کا محتاج وطالب ہوں اور دعا کرتا ہوں۔قریباً دو ہفتے نزلہ، بخار میں گرفتار رہا، دو تین ہی

دن سے طبیعت صاف ہے، والسلام۔

برادر مکرم مولوی رشید احمد صاحب کو سلام مسنون

محمد منظور نعمانی

....

حضرت مخدومی معظمی ! دامت فیوضکم

سلام مسنون

والا نامہ مورخہ ۱۶/جون موصول ہوگیا تھا جو مجھے سفر سے واپسی پر ملا، ۱۵/جون تک رجحان دیوبند نہ جانے کا تھا، ۱۶/جون کی صبح کو میں جانے کو سوچنے لگا، جانا میل سے چاہیے تھا تاکہ شروع سے کارروائی میں شریک ہوسکتا، لیکن میل کے وقت تک بھی فیصلہ نہیں کرسکا، لیکن شام کو دہرہ سے جانے کا فیصلہ کرلیا اور چلا گیا لیکن الہ آباد کانفرنس کی وجہ سے ۱۷، اور ۱۸ ہی کو رہ سکا اور کام ناتمام چھوڑ کے واپس آنا پڑا - جانا نہ جانے کے مقابلہ میں بہتر ہی ہوا، لیکن اس دفعہ کوئی غیر معمولی فیصلہ نہیں ہوا۔

....

چک اور بانڈ کی فروخت کے بارہ میں مسئلہ معلوم کرکے اطمینان ہوا۔

....

میں نے دیوبند بھی دریافت کیا تھا، مفتی مہدی حسن صاحب بھی پہنچ گئے تھے، انھوں نے کہا کہ میں تو اہل ضرورت کو دارالحرب کی بنیاد پر اس قسم کے معاملات کی اجازت دیتا ہوں۔

میرا خیال یہ ہے کہ دارالحرب اور دارالاسلام کی تعریف اور مصداق کے بارہ میں ایک دفعہ اچھی طرح اور تفصیل سے غور کرلیا جائے اور اگر فیما بیننا و بین اللہ اس بارہ میں اطمینان ہوجائے تو اس بنیاد پر پرفتویٰ دیا جائے خواہ عنوان دوسرا اختیار کیا جائے۔ فقہ حنفی کی رو سے تو مسئلہ بالکل صاف ہے اور میرا خیال تو اب یہ ہے کہ یہ مسئلہ فقہ حنفی کی دقیقہ رسی کی بڑی دلیل ہے۔

یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ سنن سعید کے بعد مصنف کی دوسری جلد کے کام سے بھی فراغت ہوچکی **للّٰہ الحمد و المنة**

اللہ تعالی بقیہ جلدوں کا کام بھی اسی طرح پورا کرائے۔

مولوی عتیق کل ہی سنبھل سے آئے ہیں، جسمانی صحت اچھی ہے، لیکن لکھنے کا کام ابھی نہیں

کرتے، دعا کی احتیاج ہے، والسلام۔
محمد منظور نعمانی

....

باسمہ سبحانہ

لکھنؤ

۷۹/۱۰/۵ یوم الجمعہ

حضرت مخدومی! دامت فیوضکم وبرکاتکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
خدا کرے مزاج گرامی ہر طرح بعافیت ہو۔

میں نے اپنا یہ معمول بنا رکھا ہے کہ اگر کچھ عرض کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو مولانا رشید احمد صاحب ہی کو لکھ دیتا ہوں تا کہ جواب کی زحمت حضرت کو فرمانی نہ پڑے، مولوی رشید احمد صاحب ہی عرض کر کے جواب مجھے لکھ دیں۔

اب سے ۸-۱۰ دن پہلے مولانا رشید احمد صاحب ہی کو اُس استفتا کے بارہ میں لکھا تھا جو حضرت کی خدمت میں لندن سے مولوی عتیق الرحمٰن کا بھیجا ہوا پہنچا ہوگا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ حضرت اس کا جواب تحریر فرمادیں تو مجھے بھیج دیا جائے، میں یہاں کم از کم دارالعلوم کے دارالافتا سے اس کی تصدیق کر کے لندن بھیج دوں گا۔ اگر مئو کے حضرات مدارس کی تصدیق بھی ہو جائے تو اچھا ہو۔

آج مناسب سمجھا کہ براہ راست حضرت کی خدمت میں عرض کروں، مولوی عتیق الرحمٰن نے اس استفتا کی ایک کاپی مجھے بھی بھیجی تھی، لیکن چونکہ مجھے معلوم تھا کہ سوال کس مسئلہ کے متعلق ہے، اس لیے میں نے اس کو کھول کے پڑھنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ میں ان دنوں میں مصروف بھی بہت زیادہ تھا۔ آج اس کو کھول کے پڑھا تو دل میں تقاضا پیدا ہوا کہ حضرت سے درخواست کروں کہ اس کا جواب تحریر کر کے مولانا رشید احمد۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ مجھے رجسٹری سے بھیج دیں میں اس کو لندن روانہ کر دوں گا۔

....

اب سے کئی سال پہلے میں اس بارہ میں حضرت سے دریافت کیا تھا تو حضرت ہی نے احکام الاحکام کی عبارت مجھے تحریر فرمائی تھی۔

پھر وہی عبارت بعینہ علامہ عینی کی عمدۃ القاری میں بھی دیکھی انھوں نے احکام ہی سے نقل کی ہے۔
مجھے یاد ہے کہ مولوی عتیق الرحمٰن نے جب مجھ سے اس مسئلہ کے بارہ میں بات کی تھی تو میں نے حضرت کے جواب اور رہنمائی کا تذکرہ کر دیا تھا۔ غالبًا اسی لیے انھوں نے حضرت کی طرف رجوع کیا ہے۔ مجھے دیوبند سہارنپور کے اصحاب افتا سے امید نہیں ہے۔ اس لیے وہاں بھیجنے کا ارادہ نہیں کیا۔

....

مولوی عتیق الرحمٰن نے یہ بھی لکھا تھا کہ ہم چاہتے ہیں کہ اس فتوے کی اشاعت عید الاضحیٰ سے کافی پہلے کر سکیں۔ خدا کرے ایسا ہی ہو جائے۔

....

اس سے پہلے عریضہ پر سہارنپور دیوبند کے سفر کا تذکرہ کیا تھا، اس سفر کے تجربہ کے بعد ہی اندازہ ہوا کہ میں سفر کے لائق نہیں ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت!

دعاؤں کا محتاج و طالب ہوں۔

مولانا رشید احمد صاحب کو سلام مسنون اور دعا کا استدعا والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

محمد منظور نعمانی

....

باسمہ سبحانہ

حضرت مخدومی و معظمی دامت فیوضکم و برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے مزاج گرامی ہر طرح بعافیت ہو، کئی مہینے پہلے سے اپنی ایک خاص ضرورت سے بھی اور زیارت کی نیت سے حاضر ہونے کا ارادہ کرتا رہا۔ لیکن کچھ ایسے حالات اور کاموں کا ایسا دباؤ ہے، کہ ابتک عمل میں نہ آسکا۔ اب مستقبل قریب میں مشغولیت کچھ اور زیادہ رہے گی، آج حسن اتفاق سے بھائی رشید احمد آگئے، تو یہ طے کیا، کہ عریضہ تو اس وقت لکھ ہی دوں، اس کے بعد زیارت و ملاقات اللہ تعالیٰ جب نصیب فرمائے۔

جس ضرورت سے حاضر ہونا چاہتا تھا، وہ یہ ہے کہ دارالعلوم کی طرف سے حدیث کا جو ایک مجموعہ مرتب کرنا میرے سُپرد کیا گیا تھا، میں نے اس کو گذشتہ رجب میں مکمل کر لیا تھا، چاہتا تھا کہ حاضر ہو کر ایک دفعہ اس کو خدمت میں پیش کروں، جو اصلاحی مشورے ہوں، ان کے مطابق تبدیل و ترمیم کروں لیکن جیسا کہ

عرض کیا، حاضری کے لیے وقت نہیں نکل سکا، اور وہاں کے تقاضے کے مطابق اس کی تبییض کرا کر بھیجتا رہا، میں نے دارالعلوم کے حضرات سے یہ عرض کیا ہے کہ اس وقت اس کو صرف پانچ سو کی تعداد میں لیتھو مشین پر چھپوالیا جائے، میں کچھ بزرگوں سے رجوع کرکے اس پر نظر ثانی کروں گا، اس کے بعد حسب تجویز اس کو ٹائپ سے چھپوایا جائے، اب انشاء اللہ اس کے تیار ہوجانے پر میں کسی وقت حاضر ہوں گا، اس وقت اسی سے متعلق ایک رہنمائی مطلوب ہے، اس کی کل حدیثوں کی تعداد ٹھیک ایک ہزار ہوگئی ہے، میرے ذہن میں اس کے لیے دونام ہیں، ایک اَلفیۃ الحدیث، بظاہر یہ سہل ہے، لیکن اس نام کی کتاب موجود ہے، اس کے باوجود متعدد حضرات کی یہ رائے ہے کہ یہی نام مناسب ہے، دوسرا نام میرے سامنے اَلف حدیث للمتعلمین والعاملین ہے، میں نے اس کی ترتیب میں تعلیمی نقطۂ نظر کی بھی خاص رعایت کی ہے، اور عمل کی بھی۔

براہ کرم ارشاد فرمائیں کہ ان دونوں میں سے کس کو ترجیح ہے۔

رابطہ کا اجلاس اس سال انشاء اللہ ١٦/ذیقعدہ سے شروع ہورہا ہے، اگر کوئی مانع پیش نہ آیا، تو انشاء اللہ حاضری ہوگی، اور واپسی انشاء اللہ حج کے بعد ہی ہوسکے گی۔

سجاد سلمہ جامعہ اسلامیہ مدینہ طیبہ چلا گیا ہے، اپنے مولوی اقبال اعظمی صاحب نے مشورہ دیا اور راستہ بھی ہموار کیا، دعا فرمائیں، اس کا وہاں قیام علمی اور دینی ترقیات کا وسیلہ بنے، اور میرے لیے بھی خیر اور رحمت کا ذریعہ۔

خود دعاؤں کا بے حد محتاج وطالب ہوں، اور اپنی سعادت سمجھ کر حضرت کے لیے دعا کرتا ہوں۔

کئی سال سے خطوط نویسی اور تحریر کا سارا کام سجاد ہی کرتا تھا، اس کے چلے جانے سے یہ بڑی زحمت ہوگئی، اب جو کوئی آتا جاتا ہے، اسی کو زحمت دیتا ہوں، یہ عریضہ بھی بھائی رشید احمد ہی سے لکھوارہا ہوں، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

٢٠/شوال المکرّم ٩٣ھ

فتاوی رضویہ کی ایک حدیث پر نظر

از: مسعود احمد الاعظمی

آج کل مئوشہر اور اس کے اطراف میں بہت زور وشور سے ایک پرچہ تقسیم کر کے عوام میں خوف ودہشت پھیلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔اس پرچے میں فتاویٰ رضویہ (مجموعۂ فتاویٰ احمد رضا خاں بریلوی) کے حوالے سے ایک حدیث نقل کی گئی ہے، پرچے کے مطابق کسی شخص نے مولوی احمد رضا خاں صاحب سے سوال کیا تھا کہ:

''جمعہ کو رمضان المبارک میں کوئی ہیبت ناک بات آنے والی ہے، جس کی نسبت حضور کی طرف بعض آدمیوں نے کی ہے کہ مولوی صاحب نے ایسا فرمایا کہ جمعہ کی رات کو ایک ہیبت ناک آواز آئے گی''۔

اس کے جواب میں صاحب فتاوی نے لکھا تھا کہ: ''آئے گی، مگر یہ نہ کہا تھا کہ اسی رمضان آئے گی۔ جب آئے گی تو وہ رمضان ہی ہوگا، جس کی پندرہویں جمعہ کو ہوگی۔ اس سال زلزلے کثرت سے ہوں گے، اولے کثرت سے پڑیں گے۔ پندرہویں شب رمضان شبِ جمعہ ایک دھماکہ ہوگا، صبح کی نماز کے بعد ایک چنگھاڑ سنائے دے گی۔ حدیث میں آیا ہے کہ اُس تاریخ کو نمازِ صبح پڑھ کر گھروں کے اندر داخل ہو جاؤ اور کواڑ بند کر لو، گھر میں جتنے روزن (کھڑکی) ہوں بند کر لو، کان بند کر لو، پھر آواز سنو تو فوراً اللہ جل جلالہ کے لیے سجدہ میں گر واور کہو'' **سُبْحَانَ الْقُدُّوس، سُبْحَانَ الْقُدُّوس، رَبُّنا الْقُدُّوس** (قدوس کے لیے پاکی ہے، قدوس کے لیے پاکی ہے اور ہمارا پروردگار قدوس ہے) جو ایسا کرے گا نجات پائے گا، جو نہ کرے گا ہلاک ہوگا''۔

جن لوگوں کے ہاتھوں میں یہ پرچہ پڑا ہے، وہ خوف ودہشت اور اضطراب وبے چینی کی کیفیت میں مبتلا ہیں، اس کیفیت کے دفعیہ اور ازالہ کے لیے ذیل میں چند باتیں اختصار کے ساتھ ذکر کی جاتی ہیں:

مذکورہ پرچے میں جو حدیث ذکر کی گئی ہے، وہ کسی صحیح اور معتبر سند سے ثابت نہیں ہے، اس

کے لیے فتاوی رضویہ میں مسند الشاشی کا حوالہ دیا گیا ہے، مُسند الشاشی کے (صفحہ۲۸۴-۲۸۵) کے علاوہ نُعیم بن حماد کی کتاب الـفـتـن (۱۸۵-۱۸۶) میں بھی یہ حدیث مذکور ہے۔ دونوں کتابوں میں اس کی سند ایک ہی ہے، بلکہ مسند الشاشی میں نعیم بن حماد ہی کے واسطے سے روایت کی گئی ہے، اس لیے کہنا چاہئے کہ اس کا واسطہ نعیم بن حماد اور ماخذ ان کی کتاب الفتن ہے، اور وہ سند ومتن کے لحاظ سے بالکل نا قابل اعتبار ہے، اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں:

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کی سند کے ایک راوی کا نام عبدالوہاب بن حسین ہے، اور اس کو امام حاکم نے اپنی کتاب مُستدرَک (۵۲۲/۴) میں اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے لسان المیزان (۸۷/۴) میں مجہول لکھا ہے، یعنی اس کے حال کا علم نہیں ہے کہ کیسا شخص تھا۔ اور ایسے شخص کی روایت قابل قبول نہیں ہوتی۔

اس راوی کی حالت تو درکنار، اسی میں شک ہے کہ اس نام کا حدیث کا کوئی راوی گزرا بھی ہے یا نہیں، چنانچہ عبدالوہاب بن حسین نام کے کسی راوی کا تذکرہ سوائے حافظ ابن حجر کی لسان المیزان کے تذکرہ وتراجم رجال کی کسی کتاب میں نہیں ملتا، جبکہ لسان المیزان سے پہلے رجال ورواۃِ حدیث پر بے شمار کتابیں تصنیف کی گئی ہیں، اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حافظ ابن حجر نے مستدرک حاکم میں اس کا نام آجانے کی وجہ سے ''لسان'' میں لے لیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس کا ذکر کر کے لکھا ہے: ویحتمل أن یکون الذي قبله یعنی اس کا احتمال ہے کہ اس سے پہلے (جس راوی کا حافظ ابن حجر نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے) یہ وہی شخص ہو۔ اور وہ عبدالوہاب بن حسن ہے، جس پر امام بخاری اور امام ابوحاتم رازی نے نہایت سخت جرح کی ہے، چنانچہ امام بخاری نے اس کو **منکر الحدیث** کہا ہے، اور ابوحاتم نے کہا ہے: **أحادیثه مناکیر لا أعرفه**۔ اور یہ اتنی سخت جرحیں ہیں کہ جس راوی پر یہ جرح کی گئی ہو، اس کی روایت اصول حدیث کی رو سے قبول نہیں کی جاسکتی۔

عبدالوہاب نے جس سے اس کو روایت کیا ہے، وہ محمد بن ثابت بُنانی ہیں، اور وہ بھی بہت کمزور ہیں۔ امام بخاری، یحییٰ بن معین، امام نسائی اور محدث ابن عدی نے اس پر سخت جرحیں کی ہیں (دیکھئے میزان الاعتدال: ۳۳/۳)۔

اور حافظ ذہبی نے تو ایک ایسی روایت کو جو بعینہ اسی سند سے مستدرک (۵۲۱/۴-۵۲۲) اور کتاب الفتن (ص۴۸۳) میں آئی ہے، موضوع قرار دیا ہے۔

لہذا جو روایت اس قدر کمزور اور نا قابل اعتبار سند سے مذکور ہو، وہ ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

اب تک ہماری گفتگو اس روایت کی سند کے بارے میں تھی، جس سے ناظرین نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ اس کی حیثیت تارعنکبوت سے زیادہ نہیں ہے۔ اب خود نعیم بن حماد کی کتاب **الفتن** کو تحقیق کی میزان پر پرکھ کر دیکھنا چاہئے، کہ محقق علماء کے نزدیک اس کتاب اور اس میں درج روایات کی کیا حیثیت ہے۔

نعیم بن حماد اور ان کی کتاب الفتن:

نعیم بن حماد (متوفی ۲۲۹ھ) کا شمار حدیث وسنت کے بڑے علماء میں ہوتا تھا، لیکن ان کے بارے میں ائمۂ جرح وتعدیل کی رائیں مختلف ہیں۔ امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، عجلی اور ابو حاتم رازی نے ان کی توثیق کی ہے؛ مگر دوسرے محدثین مثلاً امام نسائی، ابو بشر دولابی، ابن عدی اور ابو الفتح ازدی وغیرہ نے ان پر جرح کی ہے۔ نسائی کے علاوہ صحاح ستہ کی باقی کتابوں میں ان کی حدیثیں مروی ہیں، مگر بخاری نے نعیم بن حماد کی ان ہی حدیثوں کو لیا ہے، جس کو روایت کرنے والا ان کے علاوہ کوئی اور راوی بھی ہو، اور مسلم نے ان کی روایت مقدمے میں لی ہے، اصل کتاب میں نہیں لی ہے۔ ان کے بارے میں ماہرین فن کے تمام اقوال کا جائزہ لے کر حافظ ذہبی نے لکھا ہے: **نعیم من كبار أوعية العلم، لكنه لا تركن النفس إلى رواياته** (سیر اعلام النبلاء: ۱۰/۶۰۰) نعیم بڑے علماء میں تھے، مگر ان کی روایتوں کی طرف دل مائل نہیں ہوتا۔ اور حافظ ابن حجر کے نزدیک ان کا مقام یہ ہے کہ: **صدوق يخطئ كثيراً، فقيه عارف بالفرائض** (تقریب) (راست گو تھے، لیکن ان سے کثرت سے غلطیاں ہوتی تھیں، فقیہ اور فرائض کے واقف کار تھے)۔

اور ان کی کتاب الفتن کے بارے میں حافظ ذہبی کا یہ فیصلہ ہے: **لا يجوز لأحد أن يحتج به، وقد صنَّف كتاب الفتن فأتى فيه بعجائب ومناكير** (سیر اعلام النبلا: ۱۰/۶۰۹)۔ یعنی ابو نعیم کی روایت سے استدلال کرنا جائز نہیں ہے، اور انھوں نے **الفتن** کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ہے، جس میں بہت سی عجیب اور غیر معتبر باتیں لکھی ہیں، اور صالح بن محمد اسدی نے کہا ہے: **وكان نُعيم يحدث من حفظه وعنده مناكير كثيرة لا يتابع عليها** (تہذیب الکمال: ۷/۳۵۲) نعیم بن حماد اپنی یادداشت سے حدیث روایت کرتے تھے، اور ان کے پاس بہت سی

ایسی منکر حدیثیں ہیں جن میں ان کی متابعت نہیں کی جاتی ہے۔اور مسلمہ بن قاسم نے کہا ہے کہ: **كان صدوقاً وهو كثير الخطأ، وله أحاديث منكرة في الملاحم انفرد بها** (تھذیب التھذیب: ۴۶۲/۱۰) راست گو لیکن بہت غلطیاں کرنے والے تھے، ان کے پاس ملاحم میں بہت سی ایسی نامعلوم حدیثیں ہیں، جن کی روایت میں وہ متفرد ہیں۔

یہ تو ایک روایت اور اس کی سند کا حال زار ہے، اور یہی روایت فتاوی رضویہ کی بنیاد ہے، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے، کہ اس فتوے کا کیا وزن ہوسکتا ہے۔

اس مضمون کی دو روایتیں اور بھی کتابوں میں ذکر کی جاتی ہیں، لیکن وہ اس سے بھی زیادہ مخدوش ہیں۔ایک حدیث حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے کتاب **الفتن** (ص:۱۸۷) ہی میں ہے۔ اس کو عُقیلی نے بھی الضعفاء الکبیر (۵۲/۳-۵۳) میں نقل کیا ہے اور یہ فیصلہ سنایا ہے کہ اس حدیث کی کوئی مستند ومعتبر بنیاد نہیں ہے۔اور علامہ ابن الجوزی نے ''موضوعات'' میں اس کو نقل کر کے لکھا ہے: **هذا حديث موضوع على رسول الله صلى الله عليه وسلم** (موضوعات: ۴۶۱/۳-۴۶۲) یعنی یہ حدیث گھڑ کر آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کی گئی ہے۔اسی طرح اس کو حافظ ذہبی نے بھی موضوع قرار دیا ہے، نیز دیکھئے علامہ سیوطی کی اللآلي المصنوعۃ (۲/............)۔

اس مضمون کی ایک سند اور بھی ہے، اور وہ بھی انتہائی گئی گزری ہے، چنانچہ اس کو نقل کر کے علامہ سیوطی نے لآلی (۳۸۹/۲) میں لکھا ہے: **لا يصح** (یہ حدیث صحیح نہیں ہے) پھر اس کے راویوں پر نہایت سخت کلام کیا ہے۔

ان کے علاوہ متعدد بلند پایہ محدثین جیسے علامہ ابن القیم نے المنار المنيف (صفحہ ۱۱۰)، حافظ سیوطی نے اللآلي المصنوعة (۳۸۶/۲-۳۸۹) اور ملا علی قاری نے الأسرار المرفوعة في الأخبار الموضوعة (ص۴۷۲) میں اس جیسی روایتوں کو نقل کر کے ان کے موضوع ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

لہذا آج کل جو پرچہ تقسیم کیا جارہا ہے، اس کی طرف بالکل توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے، ہاں اپنے اعمال کی اصلاح کی فکر اور توبہ واستغفار وغیرہ کا اہتمام ہمیشہ کرتے رہنا چاہئے، کیونکہ گناہوں کی جب کثرت ہو جاتی ہے، اور اللہ تعالی کی نافرمانی زیادہ ہو جاتی ہے، تو انسان کو مختلف آزمائشوں اور قدرتی آفات میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔